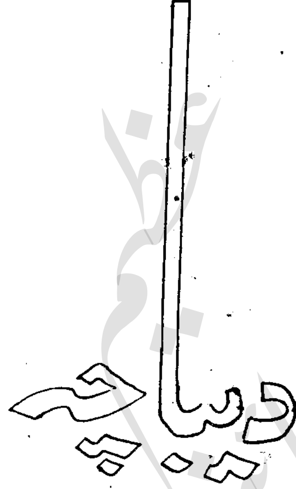
# شمع جلتی رہے گی

دیبا خانم



# دیباچہ

ہر راہگذر پہ شمع جلاتا ہے میرا کام
تیور ہیں کیا ہوا کے یہ میں دیکھتا نہیں

زیرِ نظر ناول ـــ "خوشبو تیرے نام کی" اور "پیاسی بینا" کے بعد ایک ایسا ناول ہے جو آپ کو اسی قدر پسند آئے گا ـــ جس قدر آپ کے لاشعور میں بسی ہوئی کوئی خوبصورت یاد ہو!

دیبا خانم کا یہ ناول اپنی تحریر کے لحاظ سے ایک دلچسپ واقعہ ہے ـــ کیونکہ جمیلہ یوسف نے اس کہانی کا تانا بانا بُنا اور دیبا خانم نے اسے ناول کا روپ دیا ـــ اور اس طرح یہ ناول تخلیق پایا ـــ یہ بے جان

میں دیباچہ خانم کے سب ہی گذشتہ ناولوں
سے اس ناول کا مقام یوں بھی الگ ہے۔ کر
ناول کو دو، ایک ہی معیار کی! دیموں نے تخلیق
کیا —— اور پھر یہ ناول ایک ایسی دستاویز
گیا —— جو قارئین کے لئے ناقابل فراموش تحفہ
ہو سکتا تھا۔

ناول پڑھیئے —— اور پھر رائے دیجئے۔
کیا میں نے جو کچھ سوچا وہ درست ہے؟

مخلص
یوسف جاوید

حدِ نظر تک پھیلا ہوا کریم نگر کا علاقہ ——
صبح کے آفتاب کی شعاعیں نہایت بے تکلف زندگی سے علاقے کے چپے چپے پر اپنا نقرئی جال پھیلا چکی تھیں آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں پرندوں کے غول کے غول اُڑے جا رہے تھے۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیت، کھلیان، کسان اپنے ہل سنبھالے بیلوں کی جوڑیوں کے ساتھ کھیتوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے زلف محبوب کی طرح لہراتی ہوئی پگڈنڈیاں، خمدار راستوں پر واقع بڑی بڑی جھونپڑیاں مٹی کے مکانات، چند مکانات اینٹوں اور پتھر کے بھی تھے۔ بچوں نے مٹی اور دھول میں کھیلنا کودنا شروع کر دیا تھا۔
اور نواب ارجمند خاں کی بغل میں حویلی کی سب سے اوپر والی منزل پر ایک کنارے کھڑی مزلہ اپنے اس گاؤں، اس علاقے کا پورا نقشہ آج پہلی بار دیکھ

رہی تھی۔ جس گاؤں کی وہ ادنیٰ سی گوری تھی اس کی پلکوں پہ آنسوؤں کے موتی جم
گئے تھے۔

جن کے چاروں طرف پھیلا ہوا کاجل اس کی زندگی کی طرح سیاہ لبادہ
اوڑھے ہوئے تھا ــــ مانگ اجڑی ہوئی پریشان، زلفیں تہ، خشک لب
دل پہ درد کی شدید ضرب لگی تھی۔ پیشانی پہ گہری سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں
جن کی پوشیدہ امنگوں سے کسی سنگ دل جابر کے لیے شدید نفرت جھلک
رہی تھی۔

دل کے اندر نفرت کی آگ زور پکڑ رہی تھی۔ اس کی کنپٹی کے پاس چوٹ
لگ جانے سے خون منجمد ہو گیا تھا۔ چوڑیاں ٹوٹ جانے سے کلائیاں کٹ
گئی تھیں۔ بلاؤز کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ
گئے تھے۔

سانسوں کی الجھی ہوئی آمد و رفت سے ایسا گمان ہوتا تھا۔
جیسے یہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جائیں گے۔ چہرے کے تاثرات سے
وہ اس ندی کی طرح گھمبیر اور خاموش تھی جس کی تہہ میں بے شمار حسرتوں اور
ارمانوں کی لاشیں دم توڑ کر چپ چاپ ور یہ دیکھ رہی ہو مزلہ اب ــــ "
نواب ارجمند خاں نے اپنے ایک ہاتھ کو شمال کی سمت اٹھا کر دور تک
پھیلی ہوئی سرحد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔



اشارہ کرتے وقت اس کی انگلیوں کی چند ہیرے کی انگوٹھیاں آفتاب
کی سنہری کرنوں سے ٹکرا کر چمک اٹھیں انہوں نے بات جاری رکھی۔
"جہاں تک نظریں پہنچ سکتی ہیں ــــ سب کا سب ہمارا ہے۔
"میرا ــــ لفظ میرا"، پہ انھوں نے خاص زور دیا ــــ میں اس
کا تنہا مالک ہوں اور یہاں کے لوگ میری رعایا ہیں۔ سب میں تمہیں دے
دوں گا۔ تمہارے قدموں کی خاک بنا دوں گا ــــ

مزلہ کچھ نہیں بولی۔

بس سامنے کی طرف دیکھتی رہی۔ یہاں کچھ ہی دوری پر ایک
بڑا درخت تھا۔ اس درخت کی جڑ کے چاروں طرف ایک بڑا سا چبوترہ
بنا ہوا تھا جس کی سطح پہ خون سے ہزاروں بے گناہوں کی کہانی لکھی
ہوئی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ اس کی آنکھوں
کے سامنے ایک تصویر گھوم گئی۔ اس کی چھوٹی بہن صائمہ کی تصویر ابھی
وہ چودہ برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ نواب ارجمند خاں کی ہوس کا شکار ہو
گئی اور پھر کسی کو اپنا منہ نہ دکھا سکنے کی شرم کی وجہ سے اس نے ایک رات
اس درخت کی ایک شاخ سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔
پھر دوسرے دن صبح صبح اس کے باپ نے دہائی دے دے کر انصاف

کی بھیک مانگی تھی تو ظالم نواب ارجمند خاں نے اس کی زبان بند کرنے کے
اسے بھی دوسرے الزام میں پھنسا کر اسی درخت کی جڑ سے بندھوا کر کوڑوں
سے اس کی کھال کھنچوائی تھی۔ کچھ اس زیادتی سے کہ دوسرے ہی دن وہ
مر گیا تھا۔

ظلم و ستم کے اس بھیانک انجام کو دیکھ کر گاؤں والوں میں نواب ارجمند
کی طرف سے بے انتہا خوف سما گیا تھا۔ مزلہ نے نواب ارجمند خاں کو دل سے
بد دعا دی اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس مکار کا منہ نوچ لیتی غریب لڑکی تھی وہ
صرف تڑپ کر ہی رہ گئی۔

نواب ارجمند خاں کے دل پر چوٹ پہنچی انہوں نے مزلہ کا بازو تھاما اور
اسے دوسری طرف لے گئے جنوبی حصے کی طرف کافی دور چند چنار کے درختوں
پر بیٹھے ہوئے گدھ صاف نظر آ رہے تھے انھوں نے پھر کہا۔

"وہ ان چنار کے درختوں سے بہت دور جہاں تمہاری نظر بھی نہیں پہنچ
سکتی سب ہمارا ہے میں سب کچھ تمہیں دے دوں گا۔ تمہیں اس علاقے
کی رانی بنا دوں گا یہاں کے باشندے تمہاری رعایا ہوں گے۔ لیکن ایک شرط پر
— مجھے معاف کر دو۔ میرے لیے اپنے دل میں جگہ بنا لو۔ اپنی اُداسی کو بھول
کر میرے لیے دل کھول کر مسکرانے لگو۔ مجھے اس دنیا سے اور کچھ نہیں چاہیئے!
تم خود بھی جانتی ہو مجھے اس دنیا میں کسی چیز کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ میں نے
جس چیز کی تمنا کی ہے۔ میرے ایک اشارے پر میرے قدموں میں آ گری لیکن
کل رات...... کل رات تمہارے جسم کو اپنانے کے بعد جانے کیوں
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے تم پر ہی نہیں ان
تمام لڑکیوں پر جو میری ہوس کا شکار ہونے کے بعد دکھ یا سکھ، غم کا فخر
کچھ بھی محسوس کرتی رہی ہوں۔ تمہاری ان کالی آنکھوں میں جانے کیا جادو
ہے کہ ان کی کشش سے میرے اندر کا انسان جاگ اٹھا ہے — میرے
اندر کی انسانیت مجھے لعنت ملامت کر رہی ہے۔ مزلہ کیا تم مجھے معاف کر
کے ایک نئی زندگی اپنانے کا موقع نہیں دو گی؟ —"

"نواب صاحب" مزلہ نے رندھے ہوئے گلے سے تڑپ کر کہا — "
آپ کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی — مرتے دم تک نہیں — آپ
کو معاف کر کے میں ان سینکڑوں عورتوں کے خلاف کس طرح ایک گناہِ عظیم
کا بوجھ اپنے اوپر لے سکتی ہوں۔ جن کی تمناؤں کا خون آپ کے سر ہے
ان مجبور اور بے بس لڑکیوں میں میری بھولی بھالی بہن بھی شامل ہے۔
اُسے اٹھواتے وقت آپ نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کمسن لڑکی آپ
کی نسوانی بھوک کو آسودہ کرنے کے قابل ہے بھی یا نہیں — آپ کے ظلم
کے سبب اُس نے خودکشی کر لی۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں زندہ رہوں
گی اور زندہ رہ کر دنیا کے سامنے آپ کا بھانڈا پھوٹنے کا انتظار کروں گی

آخر کوئی تو اس دنیا میں ایسا پیدا ہو گا جو آپ کے اعمال کا نتیجہ آپ کو یہیں دے سکے آپ انسان نہیں شیطان ہیں مجھے شادی کے دن اٹھواتے ہوئے آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرا بوڑھا بابا مر جائے گا سینکڑوں لوگوں کا دل اس صدمے سے ٹوٹ جائے گا۔ نواب صاحب! خدا سب کچھ دیکھتا ہے وہ صبر کرنے والوں کی سنتا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔ دولت کا یہ گھمنڈ ایک دن ٹوٹ کر چور چور ہو جائے گا۔ آپ کہیں کے نہیں رہیں گے کہ بابک سسکیاں آپ کو کھا جائیں گی میرے آنسو آپ کو جینے نہیں دیں گے میری آہیں اس خوبصورت محل کو کھنڈر بنا کر رکھ دیں گی۔"

"لڑکی! —" قریب آتے ہوئے ایک سپاہی نے مزلہ کی گفتگو سن کر جھپٹتے ہوئے اپنی تلوار میان سے باہر کھینچی اور چاہا کہ اپنے مالک کی توہین پر اس کا سر قلم کر دے لیکن تبھی نواب ارجمند خان بیچ میں آ گئے —

"جمیل! انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کرتے ہوئے کہا — کہنے دو اسے — کہنے دو۔ جو کچھ بھی اس کے منہ میں آئے اسے کہہ لینے دو اسے منع مت کرو —"

"کہوں گی اور ضرور کہوں گی —" مزلہ تڑپ کر بولی۔ "جب تک زندہ رہوں گی۔ تمہاری بربادیوں کے لیے دعائیں کرتی رہوں گی —"

مزلہ —

میں ہوش سے بیگانہ ہو رہی تھی جمیل نواب ارجمند کا سپاہی ہی نہیں دوست بھی تھا — اس سے یہ توہین برداشت نہ ہو سکی تو وہ کندھے جھٹک کر تلوار میان میں ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ مزلہ نے بات جاری رکھی آنسوؤں اور سسکیوں کے مابین اس نے بلک کر کہا — "اس حویلی میں رات دن آلو بولیں گے چمگادڑوں اور سپادوں کا یہ اڈا بن جائے گا۔ یہاں روحیں بھٹک بھٹک کر تمہارا اگلا دبانی بھریں گی۔ لوگ اس حویلی اس محل کی چوکھٹ پر تھوکیں گے ایک دکھیا کی آہ کبھی رائیگاں نہیں جائے گی!"

"مزلہ! —" نواب ارجمند نے صبر سے کام لیا۔ وہ بولے —

"کل کس نے دیکھا ہے؟ لیکن پھر بھی اگر میں اپنے گناہوں کی تلافی کر لوں تو کیا تب بھی تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟ —"

"کبھی نہیں! —" مزلہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی۔ بلکہ میں چاہوں گی کہ خدا تمہیں ایسی جگہ مارے جہاں تم پانی کی ایک بوند کو بھی ترس جاؤ۔ تمہیں جنازہ بھی نصیب نہ ہو۔

تمہارے جسم میں کیڑے پڑ جائیں گدھ اور کوے تمہاری لاش کو نوچ نوچ کر کھا جائیں —"

"نہیں مزلہ! نہیں! — ایسی نفرت مت کرو ورنہ میرا جینا دشوار ہو

جائے گا ۔۔۔"

نواب ارجمند نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کئے۔

ان کی پلکیں اب گوں ہوگئی تھیں۔

"تمہیں مجھے معاف کرنا ہی پڑے گا ۔۔۔ ضرور ۔۔۔"

"ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا ۔۔۔" مزلہ نے بدستور سامنے کیطرف دیکھتے ہوئے کہا اور انہیں دل کھول کر کوسا ۔۔۔

"ایسا وقت آئے گا ۔۔۔" ارجمند بولے ۔۔۔ "ایسا وقت ضرور آئیگا حالات کیا نہیں کرتے! تب تم مجھے معاف ہی نہیں کرو گی۔ پیار بھی کرنے لگو گی۔ میری تڑپ دیکھ کر تمہارا دل درد سے بھر جائے گا۔ میری آنکھوں میں اداسی دیکھ کر تمہاری پلکیں بھیگ جائیں گی۔ میں اپنے گناہوں کا کفارہ اسی طرح دوں گا۔ ایسا ہی کفارہ ۔۔۔ دنیا میں کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہے۔"

تبھی وہاں جمیل آ دھمکا ارجمند کی نم آنکھیں دیکھ کر اس نے مزلہ کو گھورا مگر یکایک نگاہیں پھیر کر بولا "جناب گاؤں سے فریادی آئے ہیں ۔۔۔"

"تم انہیں محل میں پہنچا دو ۔۔۔ ہم ابھی پہنچتے ہیں !! ۔۔۔"

ارجمند نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے مزلہ کیطرف اشارہ کیا اور چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

مزلہ نے نظریں جھکالیں اس نے دیکھا حویلی کے عقبی حصے میں چہار دیواری



کے اندر ایک تالاب ہے۔ چھوٹا سا تالاب ۔۔۔ خوبصورت ۔۔۔ جس کی سطح پر رنگ برنگے فوارے چلتے رہتے تھے۔ تالاب سے اٹھتی ہوئی ایک لطیف خوشبو کی لہر اس کے نتھنوں میں سے مس ہو رہی تھی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ عنبر و گلاب کی خوشبو نہیں بلکہ گاؤں کی کمسن اور معصوم لڑکیوں کے جسم سے نچوڑا ہوا خون ہے جو سڑ کر اس کے نتھنوں میں یہ بو کی شکل اختیار کر رہا ہے ۔۔۔"

---

تالاب کی یہ چہار دیواری بے حساب حسین ننگے اجسام کو مچھلیوں کی طرح بل کھا کھا کر تیرتے ہوئے برسوں سے دیکھتی چلی آئی تھی۔ تالاب کے باہر ایک سمت چند بید کے مونڈھے بچھے ہوئے تھے ادھر اُدھر سپاہی گشت کر رہے تھے۔ مزلہ نے چاہا کہ نفرت سے اس میں تھوک دے۔ لیکن اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

نواب صاحب کا خاص سیکریٹری جمیل جو کہ ایک سپاہی بھی تھا۔ اُس نے اسے چلنے کا اشارہ کیا ——

سیڑھیاں پار کرنے کے بعد وہ نیچے پہنچی اور چلتے ہوئے سامنے کے کشادہ اور طویل صحن میں پہنچی پھر اسی سے ملحق بیچ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک پل کے لیے وہ ٹھٹھکی۔ کمرے میں ایک بہت بڑی تصویر تھی —— خوبصورت



—— نہایت حسین، خوبصورت تصویر کسی غیر ملکی مصور کی بنائی ہوئی تھی۔ جس میں اُس نے طوفان میں پھنسی ہوئی ایک کشتی کو موجوں سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا تھا۔ ملاح کے چپو ٹوٹ گئے تھے پھر بھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔ تصویر کے پس منظر محرکات نے اس کے اندر زندہ رہنے کی خواہش پیدا کر دی تھی۔

اس نے سوچا وہ بھی اپنی زندگی کو نواب ارجمند کے ظلم و ستم کے تھپیڑوں سے بچا کر الگ لے جائے گی وہ دیکھے گی —— اپنی آنکھوں سے دیکھے گی کہ اس شخص کا کیا انجام ہونا ہے۔ جو ظلم و ستم کی حدود کو پار کر چکا ہے۔ وہ آگے بڑھی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

سرخ و سبز قالین، قیمتی فرنیچرز۔ خوبصورت فانوس۔ اس نے ایک دروازہ اور پار کیا۔ جہاں سے وہ جاتے وقت گذری تھی چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد پتھر کا ایک دروازہ ملا جمیل نے آگے بڑھ کر اس کی کل دبائی اور دروازہ اپنی جگہ سے سرک گیا۔ اور مزلہ اندر داخل ہو گئی۔ دن کے وقت بھی یہاں بتیاں جل رہی تھیں۔

اس نے گھوم کر دیکھا تو جمیل جا چکا تھا۔ کمرہ چاروں طرف سے اس طرح بند تھا کہ اس کی چیخ کے بھی باہر جانے کا امکان نہیں تھا۔ باہر سے دیکھنے سے کوئی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ جگہ ایک تہہ خانہ ہے —— رنگ محل

سے اس رنگ محل میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ جمیل خود ہی اس کی
دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ رنگ محل بیش بہا چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ اخروٹ
کی لکڑی سے تراشے ہوئے خوبصورت فرنیچر۔ چاندی کے بڑے بڑے گلدان
پتھر کی برہنہ مورتیاں ننگی تصویریں۔

فرش پر پڑا ہوا ایک سرخ قالین۔ لیکن درمیان میں ایک بڑا حصہ خالی
تھا۔ چکنے سنگ مرمر کے اس درمیانی فرش کو شاید نازک اندام حسیناؤں کے
تھرکتے قدموں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک طرف [illegible] رکھا ہوا تھا بڑا
اور خوبصورت جس کے اندر طرح طرح کی رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں۔
مزلہ نے انہیں دور ہی سے دیکھا۔ ان کے حال پر اسے ترس بھی آیا۔ بند
[illegible] میں ہر چیز قید ہوتی ہے۔ وہاں سے ہٹ کر وہ ایک پلنگ پر بیٹھ گئی
اس کے نازک جسم کے بوجھ سے بھی اس کا مخملی گدا اندر کو دھنس گیا۔
پیروں کو اوپر سمیٹ کر اس نے گھٹنوں کے گرد اپنی گرم بانہیں لپیٹ لیں
اور گھٹنوں پہ جھکا کر ایک رخسار اس پر رکھ لیا۔ اس کے مقابل ایک چھوٹی میز پر
ایک شمع رکھی تھی [illegible] ہونے سے قبل ہی بجھا دیا گیا تھا۔ یہاں شمعیں
کئی جگہوں پر تھیں لیکن سب ہی بجھی ہوئی تھیں۔
اس کی زندگی کی مانند۔ خاموش اداس اور بے جان ــــ اس کی آنکھوں
کے نازک اور قیمتی موتی ایک ایک کر کے پلکوں سے ٹپک پڑے ــــ "بھولا"



اس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکلی۔ وہ جیسے آپ ہی آپ بڑبڑائی۔
"تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ ــــ کیوں نہیں اپنی جان کی بازی لگا کر مجھے
بچا لیا؟؟ ــــ" وہ سسک پڑی اس کی آنکھوں کے ٹپکتے ہوئے آنسو
اس کی بانہوں سے بہہ کر اس کے سامنے زندگی کی ایک المناک کہانی کو دہرانے
لگے "بھولا؟" اس کے بچپن کا ساتھی ــــ بچپن ہی میں اس کے گھر
والوں نے اس کی منگنی کر دی تھی۔

ابھی کچھ دن کی تو بات ہے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ وہ بھولا کے ساتھ
کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی تب اس کی بہن کو مرے
ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا۔ باپ بھی سدھار گیا تھا۔ صرف بابا ہی زندہ تھے۔
اس کی ماں کے والد ماں تو کئی سال پہلے خدا کو پیاری ہو چکی تھی بھولا
نے اپنے پیار سے اس کے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دی تھیں۔ اتنی
خوشیاں کہ وہ اپنا سارا رنج و غم بھول کر جلد سے جلد اس کی بن جانا چاہتی تھی۔
بھولا گاؤں کا ایک ایسا خوبصورت نوجوان تھا جسے دیکھتے ہی گاؤں
کی لڑکیاں آہیں بھرنے لگتی تھیں لیکن وہ تو جیسے مزلہ کی خوبصورت جوانی پر بری
طرح فریفتہ تھا۔ شادی میں اسے مزلہ کے سڈول جسم، اس کے پیار کے علاوہ
پانچ ہزار روپے، اس کے باپ کی بچی ہوئی دو بیگھے زمین اور ایک جوڑی بیل بھی
مل رہی تھی۔

"اچھا بھولا ؟—" کھلیان میں ایک طرف بیٹھی ہوئی اپنے دانتوں میں ایک سکلید ڈنٹھل دبائے ہوئے مزلہ نے پوچھا— "فرض کرے میرے جہیز میں تجھے اتنی ساری چیزیں نہیں ملتیں تو تو کیا مجھ سے شادی نہ کرتا!"

"ارے پگلی—" بھولا اس کی کلائی کی سرخ چوڑیوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے بولا— "تیری سب سے بڑی دولت تو تیرا روپ ہے ان بڑی بڑی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں جو بھی جھانک لے تو بغیر غوطہ لگائے لوٹ ہی نہیں سکتا۔ عمر کا تقاضہ تجھ سے تیرا شباب ضرور چھین سکتا ہے مگر انکھوں کی یہ سحر انگیز چمک کبھی نہیں بجھے گی۔ ان پر تو میں ایسا دیوانہ ہوں کہ تو پچاس برس بعد مجھ سے شادی کرنے کو کہتی تو بھی میں انتظار کر لیتا۔"

"اچھا—"

"ہاں—"

"اور اگر میں اتنی سندر نہ ہوتی میری آنکھیں چھوٹی ہوتیں۔ تو کیا تب بھی تو مجھ سے شادی کر لیتا ؟—"

"نہیں !—" بھولا نے اُسے کھینچ کر اپنے مقابل کر لیا۔

"دیکھ مزلہ !— پیار کرنے کا ایک نہ ایک ذریعہ ضرور ہوتا ہے۔ فرض کرلے میں ہی لنگڑا پیدا ہوا ہوتا— تو کیا تیرے گھروالے اپنی ایسی خوبصورت لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا پسند کرتے ؟—"



تب ہی ان کے کانوں میں بڑھتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ ہوشیار ہو گئے۔ چاہا کہ کھلیان کے اندر ہی چھپ جائیں۔ لیکن دیر ہو چکی تھی گھوڑ سوار سامنے آچکے تھے نواب ارجمند اور ان کا معتبر سیکریٹری جمیل—

"نواب صاحب !—"

بھولا انہیں دیکھتے ہی ادب سے جھک گیا۔ ایک بار کے لیے مزلہ بھی کانپ کر جھک گئی تھی لیکن اس نے دل ہی دل میں بری سی گال دی۔

"آوارہ لفنگا۔ اس کی بہن اور باپ کا قاتل۔" نواب ارجمند کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں وہ بے رحم آنکھیں نفس پرست آنکھیں۔ اور بھینچے ہوئے ہونٹ نگاہیں جھکی ہونے کے باوجود مزلہ سب کچھ محسوس کر رہی تھی۔

"کون ہے یہ لڑکی ؟—" نواب نے جمیل سے پوچھا۔

جمیل گھوڑے سے اترا اور بڑھ کر مزلہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا نام ہے تیرا ؟—" اُس نے پوچھا۔

"مزلہ !—" جیسے گھٹی ہوئی سانس سے اُس نے کہا ہو۔

"کس کی لڑکی ہے ؟—"

"وحید کی لڑکی ہے سرکار !—"

اچانک بیچ میں بھولا بول پڑا۔

"اوہ !—" نواب ارجمند نے ایک گہری سانس لی۔ وحید کے ساتھ

صائمہ کا مکھڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ لیکن وہ خاموش نہیں ہوا۔ پوچھا۔

"اب کس کے ساتھ رہتی ہے؟ ——"

"اپنے بابا کریم کے ساتھ! ——"

"وہ کریم جو تصویریں بناتا ہے ——"

اور مزلہ نے کانپتے ہوئے ——

"ہاں! ——" کے اشارے پر سر ہلا دیا۔ جمیل نے پلٹ کر نواب ارجمند کی طرف دیکھا۔ "وہ جانتے کیوں اس حسینہ کو دیکھ کر شاہ پور کے سفر کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی؟" نواب ارجمند ایک گہری سانس لے کر پراسرار انداز سے مسکرائے۔

"نواب صاحب! ——" جمیل نے اپنے مالک کے دل کا راز سمجھ کر پوچھا۔

"اگر اجازت ہو تو اس حسینہ کو سونے کے ترازو میں تولنے کا سودا کیا جائے؟ ——" مزلہ کا دل ڈر گیا۔

وہ جانتی تھی گاؤں کی کتنی لڑکیاں سونے چاندی کی ترازو میں بیٹھ کر عزت لٹنے کا سارا غم بھول جاتی ہیں۔ لیکن وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے بھولا کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ بھیگی بلی کی طرح آنکھیں جھکائے کھڑا تھا۔



"تم کون ہو؟ ——" نواب ارجمند نے جمیل کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھولا کی طرف دیکھا۔

"جی میں ........ میں سرکار اس کا ہونے والا شوہر ہوں"

اس نے گھبرائے انداز میں اٹک اٹک کر کہا۔

نواب ارجمند نے مسکرا کر اپنے خوبصورت گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کب ہے تمہاری شادی؟ ——"

"اس چاند کی چودھویں تاریخ کو!! ——"

بھولا کی ہمت کچھ بندھی وہ سیدھا کھڑا ہو گیا ——

---

نواب ارجمند پھر مسکرائے۔

اُن کے بھرے بھرے چہرے پر مسکراہٹ بہت دلنواز لگی۔ لیکن مزلہ کو ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ جمیل جب اشارہ پاکر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا تو ایڑ لگا کر دونوں حویلی کی طرف بڑھ گئے۔

"مجھے اس نواب کے بچے کی نیت اچھی نہیں لگی ——" مزلہ ایک انجانے خوف سے لرز کر بھولا کے قریب ہوتی ہوئی بولی۔

"اور مجھے بھی !——" بھولے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مزلہ پھر بولی

"تو میرا ساتھ تو نہیں چھوڑے گا نا؟ ——"

"نہیں !—— نہیں !—— مزلہ !!—— کبھی نہیں !! مرتے دم تک نہیں !!——"



بھولے نے اُسے اپنے سینے میں چھپا لیا۔

وہ اس کے چہرے کے سائے میں گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور چاند کی چودہ تاریخ کی رات کو جب اُن کی شادی ہو رہی تھی تو یکایک ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ——

"ڈاکو آگئے !—— ڈاکو آگئے !!——"

اکثر یہ ڈاکو گاؤں کی خوبصورت لڑکیوں کی شادی کے موقع پر ہی آتے تھے۔ دھن دولت لوٹنے کی بجائے لڑکیاں اٹھا لے جانا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کو ان ڈاکوؤں پر شبہ بھی ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی غریبی اور بے بسی کے سبب دل پر صبر کا پتھر رکھ کر خاموش رہ جاتے تھے۔

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہاتھ پاؤں چلانے والوں کو بُرا انجام بھی بھگتنا پڑتا ہے اپنی بہو بیٹیوں کو کھو دینے سے بھی زیادہ بھیانک بارات میں ہل چل مچ گئی۔ ڈاکوؤں نے بہت آسانی سے مزلہ کو اٹھا لیا بھولا نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اُسی وقت سر پر لاٹھی کا ایک بھرپور وار پڑا مزلہ کی دل خراش چیخ نکل گئی وہ تڑپی، مچلی، اپنے بال نوچ ڈالے کلائی کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ چیخی پکاری۔ لیکن ڈاکوؤں نے اس کا منہ باندھ دیا۔ آنکھوں پر پٹیاں کس دیں۔ ہاتھ پیر جکڑ دیے اور گھوڑے پر لاد کر اپنے گروہ کے ساتھ کھیتوں کی سیاہ پگڈنڈیوں میں غائب ہو گئے۔

اُس کے بابا کی دلدوز دہائی اور آہ و پکار دور تک مزلہ کے کانوں میں سنائی دیتی رہی دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ لٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔ گاؤں کی ایک اور گوری چلی گئی لٹنے کے لیے ایک مقام پر سے جا کر مزلہ کو گھوڑے سے اُتارا گیا۔

پھر اسے کسی مرد کا کاندھا نصیب ہوا۔ جب کچھ دیر تک ہچکولے لگانے کے بعد اُسے بہت آہستہ سے اُتارا گیا تو اس کے قدموں تلے ملائم قالین تھا۔ چند ثانیے کے بعد قدموں کی چاپ خاموشی میں مدغم ہو گئی۔ جیسے اُسے اُٹھا کر لانے والا شخص جا رہا ہو۔ پھر دوسری چاپ قریب آئی اُس کے بالکل قریب آ کر رک گئی۔

اور تب اُس کی آنکھیں کھول دی گئیں۔

اُس کے سامنے نواب ارجمند کھڑا تھا اپنے ایک ہاتھ میں شراب کا جام لیے اسے انداز بے نیازی سے دیکھتے ہوئے جیسے اُس جیسی لڑکیوں کا وہاں آ جانا ایک بہت معمولی بات تھی۔

"دروازہ اس طرف ہے!" ——— نواب ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا "مگر تم سے وہ نہیں کھلے گا کافی طاقت لگانی پڑتی ہے کیونکہ دروازے پتھر کے ہیں" ——— مزلہ خاموش رہی بس تڑپ کر رہ گئی۔

"یہ ہمارا رنگ محل ہے!" ——— نواب ارجمند نے پھر کہا۔



"یہاں تمہیں کسی بھی نشے کی کمی کا احساس نہیں ہو گا۔ جب تک ہماری خواہش ہو گی تم یہیں رہو گی۔ ہماری رانی بن کر اُس کے بعد ہم تمہیں اتنی دولت دے دیں گے کہ تم جہاں چاہو جا سکتی ہو اور بہت شان کے ساتھ ساری زندگی گذار سکتی ہو۔"

مزلہ کے دل پر برچھیاں چل گئیں۔ نفرت سے اُس نے اپنا منہ اُس طرف پھیر لیا۔ جس طرف دیواروں پر قدِ آدم آئینے جڑے ہوئے تھے۔ رات کی نم دار مدھم روشنی میں اپنی حالت دیکھ کر اُس کا دل رو دیا۔

بال بکھرے ہوئے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے دل کی تڑپ کے زیر اثر اُس نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن جسم پر اب بھی چاندی کے گہنے چمک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے جھمکے گلے میں ایک موٹا ہار کلائیوں میں بجتا ہوا کنگن خون میں رنگا ہوا تھا۔ انگلیوں میں چند چاندی کے چھلے بھی تھے۔ ایک انگوٹھی پر کندھا تھا۔ مزلہ۔ اس کا جھومر نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ کمر ولی کمر سے نیچے لٹک آئی تھی۔

پیروں میں پائل ——— رنگین ہاتھ پیروں سے مہندی کی خوشبو اب تک آ رہی تھی۔ نواب ارجمند خاں نے شیشے کی ایک الماری کھولی جس میں انگریزی شراب کی بے شمار بوتلیں چمک رہی تھیں۔ اُس نے اپنا جام بھرا اور قریب ہی رکھے ہوئے اکواریم میں چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"مزلہ جتنی مچھلیاں اکوریم کی شان بڑھا رہی ہیں۔ اتنی ہی لڑکیاں میری بانہوں میں آ چکی ہیں جس طرح ان مچھلیوں کو پانی اور چارے کی کمی نہیں رہتی۔ اسی طرح میں اپنی بانہوں میں آنے والی تمام لڑکیوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتا۔ جس بھی مچھلی نے اپنی چھوٹی شان کی خاطر میری تکمیل تمنا سے انکار کیا ہے اُسے میں پانی سے نکال کر فرش پر چھوڑ دیا گیا اور پھر جب یہ تڑپ تڑپ کر مر گئی تو مجھے بہت لطف ملا۔

مزلہ اوپر سے نیچے تک لرز گئی۔

نواب ارجمند نے ایک گھونٹ میں شراب ختم کی اور خالی جام کو پھینکتے ہوئے تالی بجائی دو نوکرانیاں اندر داخل ہوئیں۔ جو نیم برہنہ تھیں اور جھک کر اپنے مالک کے حکم کا انتظار کرنے لگیں۔

"اس حسینہ کے جسم سے گاؤں کی یہ گندگی دور کر کے اس میں بھی شاہی نگینے جڑ دو۔" نواب ارجمند نے حکم دیا۔

نوکرانیوں نے آگے بڑھ کر مزلہ کو گھیر لیا انھوں نے اس کے جسم سے گہنے اتارے گلے کا ہار پائل کھول دی، مزلہ چوبں کی نوں بت بنی کھڑی رہی، شادی کے بوسیدہ سے جوڑے میں وہ اس وقت ایک لٹی ہوئی بیوہ لگ رہی تھی۔

ان نوکرانیوں نے جونہی اس کے جسم سے کپڑا اتارنا شروع کیا۔ اس کے



مردہ جسم میں نہ جانے کہاں سے جان آ گئی۔ اچانک اس کا ہاتھ ہوا میں لہرا کر ایک نوکرانی کے گال پر اس طرح پڑا کہ وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

طمانچے کی آواز سن کر نواب ارجمند فوراً پیچھے پلٹا۔ لپک کر مزلہ کے سامنے آیا اُسے گھور کر دیکھا۔ پھر اپنی نوکرانیوں کی طرف ——— وہ پیچھے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئیں۔

"تمہیں شاید نہیں معلوم کہ آج تک ہماری مرضی کے خلاف اس علاقے میں ایک شخص بھی نہیں پھڑ پھڑایا۔" نواب ارجمند نے اُسے بانہوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ اور اس کا چہرہ اپنے مقابل کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

"ہم نے کبھی ایسی جرأت برداشت نہیں کی ہے۔"

"اپنی دولت کے نشے میں تم کچھ بھی کر سکتے ہو ———" مزلہ نے اپنے دل کی تمام قوت کو جمع کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارا یہ ظلم زیادہ دیر تک نہیں چلے گا ———"

نواب ارجمند ایک شیر کی طرح بل کھا کر رہ گیا ——— مزلہ کے گال پر اُس نے ایک ایسا سخت طمانچہ لگایا کہ وہ قریب ہی رکھے ہوئے ایک چاندی کے گلدان سے ٹکرائی اور وہیں گر پڑی۔

اُس کی کنپٹی کے قریب زخم اُبھر آیا۔

خون کی تیز دھار بہہ نکلی۔ نواب ارجمند نے دوبارہ جام میں شراب ڈالی وہ

پتیا ہی گیا — یہاں تک کہ اُس کی غضبناک آنکھوں میں شراب کا رنگ اُتر آیا۔ چہرہ تمتما اُٹھا۔ ہونٹ سختی سے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔ اور جب اُس کے قدم مزلہ کی طرف بڑھے تو وہ لڑکھڑا رہے تھے۔

مزلہ ایک گھائل پنچھی کی طرح فرش سے اُٹھنے کی کوشش میں سہمی سہمی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ جس کے چنگل سے رہائی حاصل کرنا ایک یقینی معجزہ سے کم نہ تھا۔ شیر کی مانند میں آیا ہوا انسان ہی واپس گیا ہے؟

نواب ارجمند اُس کے قریب آیا۔ جھک کر اپنی بانہیں پھیلائے ہوئے اُسے کھڑا کیا۔ مزلہ ایک لاش کی طرح بے جان سی تھی۔ اُس نے پلکیں جھکا رکھی تھیں۔ نواب ارجمند نے اپنی ایک انگلی سے اس کی پریشان زلفوں کو اور بھی پریشان کر دیا۔

صبح کے چاند پر جیسے بادلوں کے نرم نرم ٹکڑے چھا گئے۔ نواب ارجمند نے اپنی انگلی سے اُس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اور چہرے کو بغور دیکھنے لگا دیکھتا ہی رہا۔ بہت دیر تک جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ لیکن اچانک ہی کچھ سوچ کر چونک پڑا۔

اُس کا ایک بازو پکڑ کر اُسے ایک پلنگ کی طرف لے گیا۔ اُسے پلنگ پر بٹھا کر اُس نے قریب رکھی ہوئی ایک شمع جلائی اور سوئچ آف کر کے اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اُسے بدستور دیکھتے رہنے کے بعد اچانک اُسے اپنے اندر ایک انجانی سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ مزلہ کی پلکوں پر رکے ہوئے اشکوں کے قطرے اُس کے دل پر انگارے بن کر جلنے لگے تھے۔

شمع کی روشنی میں ان آنسوؤں میں ایک عجیب ہی رنگ اُبھر آیا تھا۔ اور اُس سے پہلے کہ یہ رنگ ایک نئی شکل اختیار کر کے اُس کے احساس پر پوری طرح چھا جائے اور دل میں کسی نئی تحریک کو جنم دے۔ اُس کے دل کو ایک نئے جذبے سے روشناس کرائے۔ دل پر چھاپے ڈالے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی ہتھیلی شمع کی لو پر رکھ دی۔

---

کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ مزلہ کی سیاہ زلفوں سے بھی گہرا تاریک
اس نے مزلہ کو اپنی طرف کھینچا۔ تو وہ اپنی آگ میں جلنے کیلئے تیار ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اس رنگ محل میں نواب ارجمند کے ہاتھوں سے بچ
کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ایک غریب کے آنسوؤں کی قیمت شاید خدا
میں بھی کچھ نہیں۔ لیکن اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ طے کر لیا تھا۔

اگر زندگی نے ساتھ دیا تو ایک دن وہ اپنی نفرت کے شعلوں سے
محل کے در و دیوار کو جلا کر خاک کر دے گی۔ ظلم کی زندگی طویل نہیں ہوتی
کی ایک حد ہوتی ہے دفعتاً مزلہ کو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ اپنے
کے تانے بانے سے باہر نکلی۔ اس درمیان اس نے کتنی ساری باتیں سوچ
نظر گھما کر اس نے دیکھا کہ نواب ارجمند داخل ہو رہے ہیں۔



نوابی لباس میں اُن کا طویل قد و قامت بہت کھل رہا تھا۔ تاہم دلکش چہرے سے سنجیدگی کا رنگ نمایاں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دل کے ساتھ اُن کی ساری دولت بھی چھن گئی ہے۔ وہ مزلہ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ مزلہ نے نفرت سے اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔

"گاؤں والے اپنی فریاد لے کر آئے تھے۔" انہوں نے کہا۔

"کہ کل رات کچھ لٹیروں نے ان کی جھونپڑیوں میں آگ لگا دی ــــ"

مزلہ بدستور گم سم بیٹھی نفرت سے اندر ہی اندر انہیں کوستی رہی۔

گاؤں والے لٹیروں کے متعلق جان کر بھی انجان بنے ہوئے تھے۔ فریاد لاتے بھی تو لٹیرے کے پاس! ــــ

"میں نے ان فریادیوں کو منہ مانگی قیمت ادا کر دی ہے۔ کیونکہ ان لٹیروں سے میں ان کی حفاظت نہیں کر سکا۔ کیسے سمجھاتا کہ یہ لٹیرے نہیں۔ خود میرے ہی لوگ ہیں جن کی مدد سے میں اپنی نفسانی تسکین حاصل کرنے میں لطف اٹھاتا رہا ہوں" نواب ارجمند کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔

"صرف انہیں سمجھا دیا کہ اب یہاں کوئی لٹیرا نہیں رہے گا۔ میں نے بھولا کے مطالبے کو بھی پورا کر دیا ہے ــــ"

مزلہ کی نم پلکیں اُوپر اُٹھ گئیں اس نے حیرت سے نواب ارجمند کی طرف دیکھا۔

"ہاں! ــــ" وہ بدستور کھڑے بولے ــــ وہ اس سے

تمہاری قیمت صرف پندرہ ہزار روپے لگائی تھی ۔" کہنے لگا ۔ کہ ڈاکو مزلہ کو اُٹھا کر لے گئے ۔ سارے جہیز کو آگ لگا دی ۔ پانچ ہزار روپے نقد لے گئے ۔ میں جانتا ہوں میرے آدمی ایسی ہمت کبھی نہیں کر سکتے ۔ روپیہ تو وہ جتنا چاہے خود لے سکتے ہیں ۔ لیکن میں خاموش رہا ۔ تمہیں بھول جانے کے لیے اُس نے پندرہ ہزار روپے کا مطالبہ کیا ۔ جسے میں نے فوراً پورا کر دیا ۔"

" پندرہ ہزار ! ۔۔۔ " مزلہ کے منہ سے بے اختیار نکلا ۔۔۔ بہت حیرت کے ساتھ ۔۔۔ " ہاں ! ۔۔۔ پندرہ ہزار روپیہ تو کیا ۔ تمہاری محبت میں اسے میں اپنی تمام دولت بھی دے دیتا ۔ لیکن شرط یہی ہوتی کہ تم مجھے معاف کر دو ۔۔۔ مجھے اپنا لو ۔۔۔ مجھے اپنی مانگ میں سندور بھرنے کا حق دو ۔ مجھے یہ احساس ہونے دو کہ تم مجھے چاہتی ہو ۔۔۔ پیار کرتی ہو ۔ میرے بغیر تڑپتی ہو ۔۔۔ "

مزلہ کو بھولا پر بہت غصہ آیا ۔ زندگی بھر پیار کرنے کا دعوے کرنے والا پندرہ ہزار روپے میں پھسل گیا ۔ اُسی کی محبت کے سہارے تو اس نے اُمید کا دامن تھاما تھا کہ وہ اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی اُس نے سوچا تھا بھولا کے طاقتور بازوؤں کا سہارا لے کر وہ گاؤں والوں کو نواب ارجمند کے ترغیب دے کر ایک انقلاب پیدا کر دے گی ۔

لیکن یہ سب کیا ہو گیا ؟ بھولا اتنی جلدی بدل گیا ۔ اگر بھولا اتنی جلدی بدل سکتا ہے تو پھر دوسرے لوگ کیونکر اس کا ساتھ دیں گے ۔ پھر بھی اس نے نواب ارجمند کو جواب دیتے ہوئے کہا یہ جھوٹ ہے بھولا کبھی میری قیمت نہیں لگا سکتا ۔"

" یہ سچ ہے مزلہ ۔۔۔ یہ بالکل سچ ہے ۔۔۔ " انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا ۔ " اس حقیقت کو تم خود ہی اُس سے پوچھ لینا ۔۔۔ میں نے اس کا دل ٹٹولا تو اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اب وہ تمہیں کسی بھی حالت میں قبول نہیں کر سکتا ۔۔۔ "

مزلہ کا دل ٹوٹ گیا ۔ سر جھکا کر وہ سسک پڑی ۔

" میں تم پر کئے گئے ظلم کا معاوضہ ادا کرنے کو تیار ہوں ۔۔۔ " نواب ارجمند نے کہا ۔ " اور اس ظلم کا معاوضہ یہی ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں ۔ تمہیں اپنی بیوی بنا لوں ۔۔۔ "

" بیوی ! ۔۔۔ " مزلہ تلخ لہجہ میں بولی ۔۔۔ " مشرقی عورت صرف ایک ہی بار بیوی بنتی ہے اور وہ بیوی میں بن چکی ہوں ۔ بھولا کی بیوی ۔ ہماری منگنی پہلے ہی ہو چکی تھی ۔"

" مگر شادی نہیں ہوئی ۔۔۔ "

" تو کیا ہوا ! ؟ ۔۔۔ " مزلہ نے نڈر ہو کر کہا ۔۔۔ " میں تو پہلے ہی اُسے اپنے شوہر کا رتبہ دے کر اپنے دل کے آئینے میں مقید کر چکی ہوں ۔۔۔ میں

نے اس کی پوجا کی ہے۔ کیا ہوا۔ اگر اس نے مجھے ٹھکرا دیا میری محبت کی توہین کی! پھر بھی میں اس کی بیوی ہوں ــــ"

"لیکن اب وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا ــــ"

"سب کچھ لٹ جانے کے بعد میں خود بھی اس کے پاس جانا نہیں چاہتی خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ اس نے میرے اعتبار کو سخت ٹھیس پہنچائی ہو میں مرنا بھی نہیں چاہتی کیونکہ میں اپنے خاندان کی آخری نشانی ہوں اور اس لیے میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ زندہ رہ کر یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ ایسے انسان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ جس نے اپنے عیش کی خاطر میرے خاندان کو تباہ کر دیا اپنی نفسانی بھوک کی تسکین کی خاطر گاؤں کی گوریوں کی ڈولیاں اٹھنا دشوار کر دیا۔ جس کی اجازت کے بغیر کوئی لڑکی جوان نہیں ہو سکتی۔ اور جس نے اپنی دولت کے نشے میں ان نوجوانوں کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر دی ہے جو اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتے ہیں ــــ"

"مزلہ ــــ"

نواب ارجمند کی پلکیں بھیگ گئیں۔ مزلہ کی طنز بھری باتیں ان کے دل نشتر کی طرح چبھنے لگیں۔ انہوں نے کہا۔

"کیا اس دنیا میں میرے لیے کوئی ایسا کفارہ نہیں جس کے ذریعے تم مجھے پیار نہ سہی، معاف ہی کر سکو ــــ"



"ہرگز نہیں ا ــــ"

"مزلہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہاری خوشیوں کو برقرار رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا چاہتا ہوں ــــ"

نواب ارجمند نے اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

"اپنے دل کے آئینے پر تم نے جس بھولا کی تصویر سجا رکھی ہے وہ اس کا اہل نہیں تھا۔ اگر وہ اس کا اہل ہوتا تو تمہیں ڈاکوؤں سے رہائی دلانے کے لیے ان کا مقابلہ کرتے کرتے اپنی جان دے دیتا تمہاری قیمت لگانے کے بجائے پاگل ہو جاتا۔ اس نے تم سے کبھی بھی محبت نہیں کی۔ تم اس کی بیوی بھی نہیں بن سکیں۔ بیوی میں تمہیں بنانا چاہتا ہوں۔ محبت میں تم سے کرتا ہوں۔ جانے کونسی ایسی بات میرے دل میں گھر کر گئی ہے کہ تمہاری اتنی باتیں سننے کے بعد بھی میں اپنا دل نکال کر تمہارے قدموں میں رکھ دینا چاہتا ہوں چاہو تو مجھے آزما کر دیکھ لو۔ میرا امتحان لے لو۔ میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گا ــــ"

"اگر ایسی بات ہے تو آپ مجھے آزاد کر دیجئے۔ میں اپنے بابا کے پاس جانا چاہتی ہوں ــــ"

مزلہ نے اس قید خانے سے نکلنے کا راستہ تلاش کیا۔

نواب ارجمند کے دل پر ناکامی کا ایک وار اور ہوا لیکن وہ چپ ہی رہے

بلکہ وہاں سے ہٹ کر وہ سامنے رکھے ہوئے اکو پریم کے قریب جا کر کھڑے
گئے۔ پھر مزلہ کی جانب پشت کر کے انہوں نے زور سے تالی بجائی۔

مزلہ نے ایک طرف لگے ہوئے آئینے میں دیکھا ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی
تھیں۔ اس نے سوچا شاید وہ اپنی نفرت کی آگ کے سہارے ہی اس ظالم کو
کی محبت کی خاطر تڑپا تڑپا کر مار سکتی ہے۔ اسے اس خیال سے بدلہ لینے
تقویت ملی۔

"خادمائیں حاضر ہوئیں اور جھک کر آداب بجا لائیں۔ نواب ارجمند
کچھ ایسے سخت لہجے میں حکم دیا گویا خود پر ہی غصہ کر رہے ہوں۔ ا
نے کہا۔

"ان ساری مچھلیوں کو آزاد کر دو۔ انہیں سمندر میں پھینک دو۔"

"لیکن نواب صاحب!۔۔۔"

تب ہی جمیل نے سامنے آتے ہوئے کہا۔

"سمندر میں مچھلیاں انہیں جینے کہاں دیں گی؟۔۔۔"

"دنیا کی ہر شے آزاد رہنا چاہتی ہے اور آزادی ان کا پہلا حق ہے۔ جو
جینا ان کے اختیار میں ہے ہمیں اس سے کیا لینا؟ اس اکو پریم کو توڑ کر پھینک
دو۔ اس رنگ محل میں سجی ہوئی نیم برہنہ مورتیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر
تصویروں کو آگ لگا دو اسی وقت۔۔۔"



نواب ارجمند خاں اچانک ہی غضبناک ہو کر چیخ اٹھے تھے۔ اُن کا چہرہ غصے
کی شدت سے تمتما اٹھا تھا۔ مزلہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے لرز گئی اس قدر غصے
کی حالت میں اُس نے پہلی بار کسی شخص کو دیکھا تھا۔

"اور سنو اب۔۔۔" نواب ارجمند نے تلخی سے کہا۔ "مزلہ کو جتنی دولت
درکار ہے اس کی جھولی میں بھر دو اسے کسی بھی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہونا
چاہیئے۔۔۔"

"آپ کی دولت اگر میرے ماتھے کا کلنک مٹا سکتی تو میں یقیناً اس
کا استعمال کر لیتی" مزلہ نے آپ کا استعمال کرنا مناسب سمجھا۔ "مجھے ایک بھی
پیسے کی ضرورت نہیں ہے مجھے صرف آزاد کر دیجئے۔ اس کے علاوہ اور مجھے کچھ
نہیں چاہیئے!۔۔۔"

مزلہ نے آئینے میں دیکھا۔ اس کی بات سن کر نواب ارجمند کی آنکھیں بند ہو گئیں تھیں ہونٹوں کو سختی سے بند کئے وہ دل میں اٹھتے ہوئے درد پر غالب آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مزلہ کو ایک ہلکا سا سکون ملا، اگر یہ ظالم اس کی محبت میں یونہی تڑپتا رہا تو یقیناً ایک دن وہ اپنی نفرت کے شعلوں سے اس محل کی بنیاد گرا کر رکھ دے گی۔

جمیل اس کے قریب آیا اُسے گھور کر دیکھا۔ اپنے مالک کی توہین کے بدلے میں وہ تلوار کے ایک ہی وار سے اس ناچیز کی گردن اُڑا دینا چاہتا تھا۔ لیکن پھر صبر کر کے رہ گیا۔ جانے کیا اس جادوگرنی نے کر دیا ہے؟ اس نے کہا۔

"چلو ــــ"

اور مزلہ اٹھ کر اس کے ساتھ باہر چلی آئی۔ ایک کے بعد ایک خفیہ کمرہ



ہوتے ہوئے سرنگ کو پار کر کے جب وہ کھلے ماحول میں پہنچی تو وہ حویلی کی آخری عقبی دیوار کے باہر تھی جمیل اُسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

مزلہ نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ہی تھا کہ گاؤں والوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی کچھ لوگ تو دور ہی سے کھسر پھسر کرتے چلے آرہے تھے، عورتیں بچے، مرد سبھی اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں۔ تھکی تھکی، لٹی لٹی، اجڑی اُجڑی سی، مزلہ کی کہانی ان کے سامنے اس پودے کی طرح تھی جو بہار ہی میں آندھی کا شکار ہو گیا ہو، مزلہ نے سبھی پر نظر کی۔ ایک عجیب سی نفرت ان کی لعنت اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

یہ لوگ جو کل رات اُس کے حسن و جمال کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھونگٹ کے نیچے جھکے جاتے تھے، جو کل سے پہلے ہمیشہ اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے آج کس قدر بدلے ہوئے تھے کس قدر غیر سے دکھائی دے رہے تھے اُس نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔

کل کی اجڑی ہوئی سجاوٹ، مرجھائے ہوئے باسی پھول، پتیاں بکھری ہوئیں، پیروں تلے روندی ہوئیں۔ اُس کے ارمانوں کا خون ہو چکا تھا۔ اُس نے نواب ارجمند کو دل کی گہرائی سے پھر کوسا۔ کمبخت ایسی جگہ مرے جہاں اسے پانی کی ایک بوند بھی نصیب نہ ہو ــــ"

دروازہ کھلا اس کا بوڑھا باپ سامنے آیا کمزور اور ملائم داڑھی سر کے بالوں

پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ پلکیں دھنسی ہوئی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے پتلیاں سرخ تھیں۔ شاید تمام رات وہ بوڑھا روتا رہا تھا۔ مزلہ کو دیکھ کر اس کے لب یکایک کانپے۔ پلکیں بھیگ گئیں۔ اپنے بازوؤں کو پھیلا کر اس نے مزلہ کو گلے سے لگا لیا۔ مزلہ سسک کر اس سے لپٹ گئی۔ آنکھوں کا جہلم بہہ نکلا۔

تب ہی باہر کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان تیز کھسر پھسر ہونے لگی۔

جب بابا کے ساتھ مزلہ اندر پہنچی تو باہر کا شور و غل کچھ کم ہو گیا۔ اس نے دیکھا ہر چیز ادھر ادھر بے ترتیب پڑی گذشتہ رات کے طوفان کی دردناک داستا تھی۔ وقت کی اس بے رحمی کو........ دیکھ کر مزلہ کا دل تڑپ اٹھا۔ وا دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر وہ بابا کی طرف دیکھ کر بولی۔

"بابا!—" مزلہ کی آواز گلوگیر تھی— "میں کیا کروں میں لٹ گئی۔ نواب.......؟" بابا نے لپک کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا— اس کا نام بیٹی!— مت لے اس چنڈال کا نام۔ وہ جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی برباد ہو جائے گا تیرے باپ کی طرح وہ ہمیں بھی کسی میں پھنسا کر بے موت مار ڈالے گا۔ گاؤں میں کون نہیں جانتا اس کے ہتھکنڈ کو پھر بھی دولت کے لالچ میں یہاں کے کچھ چودھری اس کا ساتھ دے رہے تو پھر ہم غریب کیا کریں؟ تیرا بھولا بھی تو........"

"مجھے معلوم ہے بابا۔ بھولا بک چکا ہے۔ پندرہ ہزار روپے میں...."



مزلہ نے کہا۔

ابھی وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ تبھی بھولا کی آواز سن کر خاموش ہو گئی۔

"مجھے معلوم ہے بابا!—" اس نے پھر کہا۔ مگر بھولا بول پڑا۔

"ہاں— ہاں۔ بھولا بھی بک چکا ہے۔ پندرہ ہزار روپے میں بس"

وہ غصے میں چیخ رہا تھا۔

"میرے ان پیسوں کا کیا ہونا جو شادی میں برباد ہوئے تھے—"

"— بھولا—" مزلہ نے کہنا چاہا۔

"مر گیا بھولا— اور تو بھی بھولا کے لیے مر چکی ہے—" بھولا نے اپنے شانوں کو جھٹکا "تیرے لیے تو یہی اچھا ہے کہ ڈوب مرے ایسے حالات میں کون مرد کا بچہ ہے جو تجھے اپنانے کی ہمت بھی کرے گا؟—"

"لیکن اس میں میری بچی کا کیا قصور ہے؟—" بابا نے آگے بڑھ کر کہا۔

"آخر تمہاری تقدیر کا قصور تو ہے؟—" بھولا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا— "وہ پھر بھلا میں تمہاری تقدیر کی قیمت کیوں بھگتتا پھروں—"

"تو پھر اب تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟—" دفعتاً مزلہ نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے سختی سے کہا۔

"اپنا نام سن کر چلا آیا تھا—" بھولا نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور

زور سے چیخا۔

"ذرا لوچھ کر تو دیکھ باہر کھڑے لوگ تیرے متعلق کیا کہہ رہے ہیں"

"کیا کہہ رہے ہیں؟ ———" مزلہ نے سختی سے پوچھا ——— "وہ یہی
مزلہ نے اپنے گھر لوٹ آنے کی جسارت کیسے کی؟ ندی میں ڈوب کیوں
مری؟ لیکن تو خود ہی ان سے جاکر کیوں نہیں پوچھتا کیا ان کی بھی کوئی اولا
ہے؟ ان کی بھی کوئی لڑکی ہے؟ خوبصورت جوان؟ اگر ہوتی تو میرے
کبھی ایسی بات نہ نکالتے؟ میرا ساتھ دے کر اس شیطان کا سر کچل ڈالنے
کے لیے ایک عورت کی زندگی کھیل بن چکی ہے۔ یہ تو ٹکڑ گدے ہیں کمینے
لوگ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے سبب کوئی بھی اس ظلم کے خلاف آواز
نہیں کر سکتا۔ انہی کے خوف کے سبب کتنے ہی غریبوں نے پیدا ہوتے
اپنی لڑکیوں کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور جس کے یہاں لڑکے پیدا ہوئے
بری طرح نکمے نکلے ———"

"مزلہ! ———"

بھولا بل کر طیش سے چیخا۔

"میں کہوں گی ہزار بار کہوں گی تو نکما ہے ——— کمینہ ہے ——— نواب
رحمند خاں ......."

"مزلہ ب ———" معاً بابا نے تیزی سے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔



"مت لے اس کا نام" یہی اچھی بات ہے جو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ظالم کون ہے؟
نام لینے سے بات بڑھ جائے گی اور پھر ہماری زبان کاٹ ڈالی جائے گی۔ اب
ہم یہاں نہیں رہیں گے ——— یہ جگہ ہمارے لیے جہنم سے بھی بدتر ہے ———"

بابا کی آنکھیں امڈ آئیں۔ اس نے مزلہ کو گلے سے لگا لیا۔

بھولا تلملا کر رہ گیا۔ زمی سے مسکرایا بھی۔ مزلہ کا بوجھ اس کے سر سے اتر
چکا تھا۔ پندرہ ہزار روپے پاکر وہ مزلہ کو چھوڑنے کا بہانہ ہی تو تلاش کر رہا تھا
وہ دوڑ کر باہر نکل گیا۔

بابا نے اپنا سوٹ ا بہت ضروری سامان جمع کیا۔ چادر میں باندھ کر بوڑھے
اور کمزور کندھے پر ڈال لیا۔ گاؤں کے گنے چنے زرخرید غلام ...... انہیں
بڑی ذلت کی نظر سے دیکھ رہے تھے خصوصاً ان لوگوں کی آنکھیں ڈبڈبا
گئی تھیں جو اپنے گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے چھپ کر خاموش
کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

ان کے خیالات کسی کے غلام نہیں تھے۔ لیکن طاقت اور ظلم وستم کا پلہ بھاری
دیکھ کر کمزور پڑ چکے تھے۔ ان کی اپنی بھی جوان لڑکیاں تھیں۔ جنہیں وہ کبھی بھی بن
سنور کر پنگھٹ پر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مبادا کہ ان کا
پرکشش سراپا کو دیکھ کر اس علاقے کا نواب فریفتہ ہو بیٹھے ———
کچی سڑک۔ پگڈنڈیاں، کھیتوں کی منڈیریں اور ناہموار راستے پار کرنے

کے بعد جب وہ دونوں بہت دور پہنچے تو مزلہ نے پلٹ کر اپنے گاؤں کو آخری بار دیکھا جہاں اس کا بچپن گذرا تھا۔ جہاں بچپن ہی میں اس کے شباب کی حفاظت کے خیال سے اس کے باپ نے اس کی منگنی بھی بھولا کے ساتھ کر دی تھی۔ شاید شادی بھی کبھی کی ہو چکی ہوتی اگر اچانک اس کی ماں کا انتقال نہ ہو جاتا۔ اگر اس کی چھوٹی بہن کو یہ ظالم نواب لوٹ نہ لیتا اگر اس کے باپ کو کوڑے کھا کر اپنی نہ گنوانی پڑتی۔ اکثر گاؤں میں بچپن میں شادیاں اسی لیے کر دی جاتی تھیں تا کہ لڑکیوں کی عزت کی حفاظت ہو سکے۔

پھر بھی نوابوں کے خوف سے کوئی بارات اتنی آسانی سے نہ اٹھ پاتی۔ ڈولی اٹھانے والے کہاروں کے پیر اکھڑ جاتے تھے۔ اپنا گاؤں۔ اپنے کھیت ان کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں کے اوپر ادھر ادھر اڑتے پرندے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ہونٹوں سے آہ نکل گئی۔ اس نے دل سے نواب کو پھر کوسا۔ دور سرخ گگن کے رخسار چومتی ہوئی ایک سفید حویلی شام کے دھندلکے میں ڈوب رہی تھی۔

اس درخت کی بلند چوٹی بھی دکھائی پڑی جس کی چھاؤں تلے کئی مسلی آئی۔ اور کئی زندگیاں دم توڑ چکی تھیں۔ اس نے دیکھا ایک بڑا سا گدھ حویلی پنکھ پھیلائے اڑا چلا جا رہا ہے اسی طرف ہلکی ہلکی گرد اڑ رہی تھی۔

اچانک اس اڑتی ہوئی گرد کے درمیان اس نے گھوڑوں کی ٹاپیں سنی تو اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا۔ خوف زدہ سی ہو کر اس نے اپنے بابا کی طرف دیکھا۔ اس نے لپک کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

پھر وہ ششدر سے چھپنے کی کوئی جگہ تلاش کرنے لگے لیکن وقت کم تھا۔ انہوں نے دیکھا گھوڑ سوار قریب آ چکے تھے۔ گھوڑ سوار دو تھے نواب ارجمند خاں اور ان کا سیکریٹری جمیل ـــ اس کی مونچھیں بڑی بڑی، چہرہ کشادہ، جسم تندرست تھا۔ جبکہ نواب ارجمند ایسا نہیں تھا۔ اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لندن کے ماحول، تہذیب و تمدن میں گذارنے کی وجہ سے وہ وہ مونچھیں رکھنے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ گھنی بھنوؤں کے نیچے بڑی بڑی سیاہ پلکیں ان کے خوبصورت سفید چہرے پر بہت دلکش معلوم ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ اس جوانی میں ان کا کردار اس قدر بھیانک ہو سکتا ہے چہرے پر سختی اور بے رحمی کی کوئی علامت نمایاں نہیں تھی۔

شہسوار آ کر ان کے قریب کھڑے ہو گئے مزلہ اپنے بابا کے اور قریب ہو گئی۔

"مزلہ! ـــ" نواب ارجمند نے کہا "تم چاہو تو اسی گاؤں میں رہ سکتی ہو۔ ہمارے قصبے میں ـــ تم پر انگلی اٹھانے والے کا ہم سر قلم کرا دیں گے ـــ"

مزلہ کچھ نہیں بولی ـــ لیکن اس کے بابا کی بوڑھی رگوں میں اچانک خون جوش مارنے لگا ـــ

---

مزلہ کو ایک طرف کر کے وہ اس کے قریب آیا۔ اور سخت غصے اور نفرت بھرے لہجے میں مخاطب ہوا۔

"نواب صاحب! ـــ کسی کو مار کر قیمتی کفن پہنا دینے سے بھلا نہیں ہو جاتا۔ مزلہ کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دینے سے تو یہ اچھا ہے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں!"

جمیل اپنے مالک کی شان میں ایک معمولی سے شخص کے یہ توہین آمیز الفاظ سننے کی تاب نہ لا سکا اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی ایک چھلانگ میں اس کے قریب پہنچ کر اس نے کوڑا ہوا میں لہرایا اور پلک جھپکتے ہی بابا کے جسم پر دے مارا بابا کا بوڑھا جسم کوڑے کی ضرب کی تاب نہ لا کر ایک ہی وار میں گھائل ہو کر زمین پر گر پڑا۔

"جمیل!" — نواب زور سے چیخے۔

جمیل کی یہ غیر مناسب جسارت انہیں ذرا بھی پسند نہیں آئی تھی۔

مزلہ بچاؤ میں اپنے بابا سے لپٹ گئی دانت پیستے ہوئے اس نے نفرت سے پہلے جمیل کو دیکھا پھر نواب ارجمند کو۔ نفرت اور غصے کی ایک ایسی شدید چنگاری اس کی آنکھوں میں لرز رہی تھی کہ اگر اس کے امکان میں ہوتا تو شاید وہ انہیں نظروں ہی نظروں سے جلا کر راکھ کر دیتی۔

"مار ڈالو — مار ڈالو ہمیں — شدید کرب سے مزلہ چیخ اٹھی —

"ظالم پاپی۔"

طیش میں آکر جمیل نے اپنا کوڑا دوبارہ ہوا میں بلند کیا۔ لیکن اچانک اپنے مالک کی خونبار آنکھیں دیکھ کر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے یہ پہلا موقع تھا کہ نواب ارجمند کو اس پر اس قدر طیش آیا تھا۔

"خدا تمہیں تباہ کر دے —" مزلہ غم و غصے سے کہتی رہی — "تم برباد ہو جاؤ۔ لٹ جاؤ خدا کرے مرنے سے پہلے تم خوب تڑپو۔ کوئی تمہیں ایک بوند پانی کو بھی نہ پوچھے۔ ظالم کرٹ —" مزلہ نے غصے سے دانت پیسے —

جمیل غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ لیکن ارجمند کے ہونٹوں پر ایک آہ ابھر آئی۔ گھوڑے سے اتر کر وہ مزلہ کے قریب پہنچے۔ بہت درد بھرے لہجے میں بولے۔

"ٹھیک ہے مزلہ! تم یہاں نہیں رہنا چاہتی ہو تو نہ رہو — لیکن جہاں



بھی رہنا اتنا ضرور یاد رکھنا اگر مجھے معاف کرنے کی کوئی قیمت درکار ہو تو وصول کرنے میں پس و پیش مت کرنا۔ میں ہر طرح سے عفو گناہ کیلئے قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں —" نواب ارجمند — پلٹ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے سیکریٹری کی طرف دیکھ کر بولے۔

"آؤ چلو جمیل —"

اور پھر انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ جاتے وقت ان کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ جمیل ان کے پیچھے ہو لیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ جب دونوں گرد کے غبار میں گم ہو گئے تو مزلہ نے سہارا دے کر اپنے بابا کو اٹھایا اور بڑھتی ہوئی دھند میں ایک انجانی منزل کی راہ لی۔

محل کی دوسری منزل پر نواب ارجمند ایک صوفے میں دھنسے ہوئے خاموش بیٹھے تھے، ان کا ولایتی کتا بہت آزادی کے ساتھ ان کے قریب ہی بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ ایک طرف جمیل ایک بڑی میز کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھا شراب کا جام چڑھا رہا تھا۔

جمیل ان کا دایاں ہاتھ تھا بہت معتبر اور شفیق دوست، بالکل اپنے باپ داداؤں کی طرح۔ جنہیں نواب ارجمند کے اجداد کی خدمت گذاری میں ایک معتبر اور وفادار نوکر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ گذشتہ تین دن سے محل کی اداسی۔ نیم تاریک راتیں حیات نو کی حسین رنگینیوں کو ترس گئی تھیں۔ یہ سونا سونا ماحول

زبان حال سے اس بات کی ایسی سرگوشی کر رہا تھا۔ جیسے اس محل، اس حویلی میں کوئی موت واقع ہوگئی ہو۔ کوئی شور و غل نہ تھا۔ رقص و طرب کی محفل، قہقہے اور نہ کوئی جگمگاہٹ۔

یہ غیر معمولی تبدیلی محل کے سپاہیوں سے لے کر گاؤں کے کونے کونے میں گفتگو کا موضوع بنتی جارہی تھی۔ "نواب صاحب!۔۔" جمیل نے شراب کا جام لبوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "آخر اس لڑکی میں کونسی ایسی بات ہے جس نے آپ کا جینا حرام کر دیا ہے؟۔۔۔"

"یہ بات میں خود بھی سمجھنے سے قاصر ہوں جمیل!۔۔" انہوں نے چاندی کی انگوٹھی کو داہنے ہاتھ کی انگلی کی مدد سے گھماتے ہوئے جواب دیا۔ یہ انگوٹھی مزلہ کی تھی جس پر اس کا نام نقش تھا۔ اسے وہ دیگر تمام زیورات کے ساتھ رنگ محل میں چھوڑ گئی تھی۔ انہوں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن کوئی نہ کوئی بات اس لڑکی میں ضرور ایسی تھی جس نے میرے اندر ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے میری زندگی کے راستے کو بدل دیا ہے۔ ممکن ہے یہ اس کی مقناطیسی آنکھوں کا ہی ردعمل ہو شاید اس کے آنسوؤں میں ہی ایسا جادو ہو۔ شاید اس کا مجھ سے اس قدر نفرت کرنے کا ہی یہ اثر ہے جو شے مشکل سے دستیاب ہوتی ہے اس کے لیے دل میں گوناگوں اشتیاق بڑھتا ہے۔ قدرتی بات ہے اس کی دلسوز آہ کی صدا اب تک میرے کانوں میں بازگشت کر رہی ہے مجھے یہ ڈر محسوس ہو رہا ہے جمیل!۔ کہیں اس کے شکستہ دل سے نکلی ہوئی یہ دعا حقیقت بن کر سامنے نہ آجائے۔۔۔"

"گولی ماریئے ایسی بددعا کو آپ بھی کیا بات لے کر بیٹھ گئے۔" جمیل نے دوسرا جام اپنے مالک کے لیے بھرا پھر بولا۔

"جب تک انگریزی راج ہے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔۔۔"

"یہ راج تو چار دن کا ہے آخر ایک نہ ایک دن تو انہیں آزاد ہونا ہی ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ نواب ارجمند زندہ تو رہیں گے اتنی بڑی جائیداد، دولت، کوٹھیاں، محل سب کا سب ہی آپ کا تو رہے گا۔ اگر حکومت نے کچھ لے بھی لیا تو اس کی پوری پوری قیمت ادا کرے گی۔ آخر آزادی حاصل کرنے کے لیے جو اخراجات ہو رہے ہیں ان کا بوجھ آپ جیسے ہی نوابوں پر تو ہے۔۔۔"

"مجھے اس کی فکر نہیں ہے جمیل! جو ہمارا حق ہے وہ ہمیں ملے گا ہی۔ لیکن جب سے مزلہ نے ایک بات کہی ہے میرے دل میں ایک شبہ نہ جانے کیوں کانٹا بن کر کھٹکنے لگا ہے۔۔۔"

"اس کانٹے کو پھول میں بدل دینے کا ایک ہی راستہ ہے۔" جمیل جام ہاتھ میں لے کر اس کے قریب آیا۔ بولا

"اپنے آپ کو دوبارہ حسین دوشیزاؤں کی صحبت میں مگن کر دیجیے۔ گاؤں میں ابھی ایک سے ایک لڑکی ہے شراب اور شباب۔ شباب اور شراب ان

دو چیزوں کا کٹیل ہمیشہ نوابی خاندان کو راس آیا ہے۔ اس سے ایک لمحہ بھی پرہیز
اور بیماری حاضر رہی، آپ کی شان کو زیبا نہیں کہ گاؤں کی ایک ناچیز چھوکری
اس نوابی خاندان کی پریشانی کا باعث بنے ـــ"

"جمیل !! ـــ" نواب ارجمند جام ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوتے ہوئے
کھڑکی کے نزدیک آئے۔

باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ جس کی روشنی میں وہ سامنے کے دیو ہیکل
درخت کو بخوبی جھومتے ہوئے دیکھ رہے تھے انھوں نے ایک آہ بھر کر کہا
"کبھی کبھی امر بیل کی ایک چھوٹی سی کترن بڑے سے بڑے درخت کو بھی
آسانی سے نگل جاتی ہے۔ منزلہ کے جانے کے بعد میں نے ہمیشہ اس درخت
کے پتوں کو جھڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم ہی دیکھو، اس کی شاخیں کس قدر
خالی سی لگنے لگی ہیں۔"

"یہ تو خزاں کا موسم ہے جناب! پتوں کا جھڑنا تو قدرتی عمل ہے ـــ"

"ہاں لیکن جانے کیوں اس کی خزاں رسیدہ حالت دیکھ کر مجھے اپنے
بارے میں ایک عجیب سا یقین ہوتا جا رہا ہے ـــ"

جمیل اپنے مالک کی حالت پر ترس کھا کر رہ گیا۔ لیکن پھر سوچا جوانی کا خوا
ہے دل کا لگ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ کچھ دن بعد جب منزلہ کی یاد خود
دھندلی ہو کر مٹ جائے گی۔ تو رنگ محل کی رنگ رلیاں پھر شباب پر آ جائیں گا

نواب ارجمند متواتر سامنے دیکھتے رہے۔ جام ہاتھ میں لیے ہوئے۔ اس
درخت کو ان کے پر دادا نے خود لگایا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا
جب ان کے والد چھوٹے چھوٹے جرم پر بھی گاؤں کے لوگوں کو اسی درخت کی
جڑ سے بندھوا کر کوڑوں سے بے رحمی کے ساتھ مار مار کر بے جان کر دیتے تھے
اپنے بچپن میں جب انھوں نے اپنے باپ کو پہلی مرتبہ ایسا ظلم کرتے ہوئے
دیکھا تھا تو وہ تڑپ اٹھے تھے۔

مجرم کی پیٹھ پر خون کی بہتی ہوئی دھار کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چھلک آئیں
تھیں تب قریب کھڑے ہوئے ان کے دادا کو اپنے پوتے کی ناتوانی اور بزدلی پر
بہت غصہ آیا تھا اور اس حادثے کے بعد ہر مجرم کو کوڑے نکالتے ہوئے دیکھنے
کی غرض سے انہیں صرف اس لیے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کا دل پتھر
ہو جائے۔

نواب کا دل پتھر نہ ہو تو نوابی ٹھاٹھ آسانی سے نہیں چلتا۔ اور پھر وہ صرف
نواب ہی نہ تھے بلکہ اپنے علاقے کے راجہ کی طرح تھے۔ انہیں تمام قانونی مراعات
انگریزی راج نے دے رکھی تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرتے تھے۔ انہیں
حکومت بھی نہ پوچھتی تھی۔ ان کے نوابی خاندان کا اصول تھا۔ غریب عوام کو
ذرا بھی ڈھیل دو۔ تو یہ ایک کے بعد ایک مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ اور اسی
لیے اپنے خاندان کے چلن کا پاس رکھتے ہوئے انھوں نے اس بات کی سعی

کی تھی کہ وہ زندگی کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھائیں گے۔

ان کی پوری تعلیم لندن میں ہوئی وہیں کے ماحول میں کھیلے کودے اور جب جوان ہوئے تو یہاں کے نواب جو ان کے والد تھے کی اچانک موت ہو جانے سے انہیں علاقے کی ساری ذمے داریاں اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑیں۔

جمیل بہت معتبر سیکریٹری تھا۔ اس نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ علاقے کے کاموں میں بھی اور عیاشی میں بھی۔ پہلی لڑکی کی صحبت کے بعد نفس پرستی کی پیا شدت سے بڑھتی ہی گئی۔ جتنی زیادہ لڑکیاں ان کے قرب میں آئیں۔ نفس کی شیطانی پیاس اسی شدت سے بڑھتی گئی۔ انہیں یہ بھی احساس ہوا تھا۔ کہ ا بے حرمی کے بعد بھی کسی حسینہ کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ بلکہ چند لڑ تو ایسی بھی آئیں جو ان کی باہوں میں کھلونا بننا ایک فخر کی بات سمجھتی تھیں۔ باہوں کے ساتھ ساتھ انہیں منہ مانگی دولت بھی ملتی تھی۔ زمینیں معاوضہ میں جاتی تھیں ——



کچھ لڑکیوں کو یہاں تک فخر تھا کہ ان کی رگوں میں نوابی خون موجزن ہے۔ کیونکہ ان کی ماں بہت حسین تھی۔ اس نوابی خاندان کے فلاں نواب کی محبت کا انہیں امتیاز حاصل ہو چکا تھا۔ نوابوں کی اولاد نوابوں کی ہی راتیں گرم کرتی تھی۔

ان کی دادیاں یا نانیاں فخر سے اس محل میں انہیں لاتی تھیں۔ صرف قیدی لڑکیاں ہی تھیں جو ان کی باہوں کی گرفت میں آنے کے بعد تھوڑا بہت [illegible] تھیں بلن بچے نکلنے کا کوئی ذریعہ نہ پا کر آخر خود کو ان کے سپرد کر دینا پڑا تھا۔

جنہیں اپنی ننگ و ناموس کا لٹ جانا راس نہ آیا، انہوں نے خودکشی کر لی ی۔ لیکن ایسی لڑکی ان کی اب تک کی زندگی میں صرف ایک ہی آئی تھی۔ مزلہ کی ہوئی بہن جس کے حق میں آواز بلند کر کے جب اس کے باپ نے لوگوں کو نواب جنید کے خلاف ورغلایا تھا۔ تو جمیل نے اپنے ہاتھوں سے کوڑے مار مار کر

اسے نیم مردہ کر دیا تھا۔

اس طرح کہ وہ دوسرے ہی دن چل بسا تھا۔ اس حادثے سے کچھ دن
گاؤں کے اندر سنسنی سی پھیل گئی تھی ان خاندانوں کے دلوں پر جہاں جوان بیٹیا
تھیں۔ ایک خوف طاری ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے لڑکیوں نے پنگھٹ
چھوڑ دیا تھا۔

انہیں اس بات کا یقین تھا کہ جمیل اس خاندان کو جڑ سے مٹا دے گا۔ ج
خاندان کے کسی ایک فرد نے بھی نواب ارجمند پر انگلی اٹھانے کی سعی کی۔
جمیل کے باپ دادا نواب ارجمند کے باپ داداوں کی عزت کو برقرار رکھ
لیے ایسا ہی کرتے آئے تھے۔ صائمہ مزلہ کی بہن تھی۔ مزلہ کی طرح مغرور اور کڑ
ارجمند بہت مشکل سے اس پر قابو پا سکے تھے پھر بھی وہ اپنی عزت و حر
مسلم رکھنے کی کوشش آخری وقت تک کرتی رہی تھی اور جب صبح
ہونے سے پہلے اسے محل کی پچھلی چہار دیواری کے پیچھے چھوڑا گیا، تو وہ ا
گھر واپس نہیں گئی تھی اور نہ اس نے گاؤں والوں کو اپنی صورت دکھائی تھی
ے بچنے کی غرض سے اس نے اسی درخت سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔ اگر
کی بھیانک موت سے نواب ارجمند کو درحقیقت سخت دھکا لگا تھا۔
دل کو چوٹ پہنچی تھی لیکن جمیل کی صحبت نے رفتہ رفتہ اس چوٹ کو م
کر دیا۔ وہ اس حادثے سے متعلق سب کچھ بھول گئے اور ایک بار پھر ازم

رلیوں میں مگن ہو گئے تھے۔ ہر روز نئی لڑکی کی ہم آغوشی حاصل کر کے وہ پھر سے زندگی میں عیش و عشرت کا لطف اٹھانے لگے تھے۔ لیکن مزلہ، نہ جانے اس کی شخصیت میں صائمہ کی طرح کون سا جادو پوشیدہ ہے کہ تین دن گزر جانے کے بعد بھی وہ اسے نہیں بھول سکے اور اب انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اسے کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ آنکھوں سے برستے ہوئے آنسوؤں نے ان کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

وہ جوش و خروش زندہ دلی سب کچھ صلب ہو گئی تھی۔ جسے انہوں نے زندگی کی لطافتوں کا ضامن سمجھ رکھا تھا۔ مزلہ اپنے خیال میں جیسے ان کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے تعین کردہ راستے سے ہرگز نہیں بھٹکیں گے۔ انہوں نے معصوم زندگیوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے ہیں۔ انہیں لوٹا ہے۔

روحوں کو کچلا ہے اور ان کے ارمانوں کا خون کیا ہے۔ اتنا سارا گناہ اتنا زیادہ! شاید خدا انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں — اس کے باوجود وہ اپنے گناہوں کا پورا پورا کفارہ ادا کریں گے شاید ان کی اس بے مثال توبہ سے متاثر ہو کر مزلہ کے دل میں ان کے لیے تھوڑی سی ہی ہمدردی پیدا ہو جائے نفرت کی آگ کم ہو جائے۔ اور تب وہ انہیں معاف کر دے۔ مزلہ کی زبان سے نکلے ہوئے دو بول ہی ان کی زندگی کے لیے بہت ہیں۔

اُن کے گناہوں کا کفارہ از خود ہی ہو جائے گا۔ مزلہ کے معاف کر دینے کے
بعد شاید صائمہ کی بھٹکی ہوئی روح کو سکون مل جائے گا اُس کی بہن ہوتے ہوئے
وہ بھی اُنہیں معاف کر دے گی۔ ممکن ہے اُن تمام روحوں کو سکون مل جائے جو
اس نوابی خاندان کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر اب تک بھٹک رہی ہیں۔ ایک
فرد کی سچی توبہ اُس کے اجداد کے گناہ بھی دھو دیتی ہے۔ جمیل نے جب نواب
ارجمند خاں کو اتنی دیر تک خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا دیکھا تو وہ
اُن کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے باہر کی طرف دیکھا۔

بڑے گیٹ پر سپاہی پہرہ دے رہے تھے اور جب کوئی نہیں دکھا
دیا تو ہونٹوں کو چباتے ہوئے مسکرایا ـــــ

"میں پوچھ سکتا ہوں نواب صاحب کن خیالات میں کھوئے ہوئے ہیں !
وہ مخاطب ہوا۔

"اگر حکم ہو تو گاؤں کی ساری ہی جوان دوشیزاؤں کو ایک ساتھ حاضر کر
حضور کے دل کو بہلانے کا انتظام کیا جائے ـــــ"

نواب ارجمند خاں نے اپنے بازو کھڑکی پر ٹیکے اور کچھ جھک کر اسی طرح
دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس ایک بہن ہے نا ـــــ"

"جی ! ـــــ"

جمیل اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"جوان ہے اور خوبصورت بھی کافی ہے ! ـــــ" اُنہوں نے اپنے
ہاتھ پشت کے پیچھے باندھ کر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے چہرہ باہر کی طرف
اُسی طرح کیئے بہت ہی اطمینان کے انداز میں پوچھا۔

"جی ! ـــــ"

جمیل تن کر کھڑا ہوا۔ اس طرح جیسے اُس کے گال پر ایک تھپڑ پڑنے والا ہو۔

"میرا دل بہلانے کا اتنا ہی شوق ہے تو آج اسی کو بھیج دو ـــــ"

"نواب صاحب ! ـــــ" جمیل کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس طرح جیسے
واقعی نواب ارجمند نے اُس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا ہو۔
اُس کے ہونٹ بھینچ گئے اور مٹھیاں سخت ہو گئیں۔ نواب ارجمند نے
فوراً پلٹ کر اُس کا سامنا کیا پھر نہایت سنجیدہ لیکن تنبیہہ کے لہجے میں کہا۔

"آئندہ خیال رکھئے۔ گاؤں کی ہر لڑکی کے پاس ماں باپ نہیں بھائی کوئی نہ
کوئی ایسا ضرور ہوتا ہے جس کے دل پر ایسی ہی چوٹ لگتی ہے۔ جس کا درد
تم نے ابھی ابھی محسوس کیا ہے۔ جمیل کی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ سر بار ندامت
سے جھک گیا۔

"تم جا سکتے ہو ! ـــــ" انہوں نے کہا۔ اور بھاری قدموں سے چل کر
صوفے میں دھنس گئے۔

کچھ دن اور گذر گئے۔

محل کا سارا رومان کافور ہو چکا تھا۔ اُس کی جگہ جیسے ہر چیز نے لباسِ ماتم پہن لیا تھا۔ روشنی کی نہ کوئی جگمگاہٹ تھی نہ عیش و نشاط کے ہنگامے اور نہ زندگی بھرے قہقہے۔ نواب ارجمند خاں نے شراب نوشی بھی کم کر دی تھی بلکہ اب وہ شراب صرف اُسی وقت پیتے جب دل کا درد ضبط نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مزلہ کا غم اُن کی حیات میں ناسور کی طرح رس رہا ہے۔

اکثر ایسی ٹیسیں اُٹھتیں کہ وہ بے چین ہو کر کمرہ بند کر کے تڑپتے رہتے۔ مزلہ کی تصویر کا نقش اُن کے دل کی لوح پر دن بہ دن گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔ مزلہ کے خیال سے وہ جتنا بھی دور بھاگنے کی کوشش کرتے مزلہ اتنا ہی ان کے ذہن سے اور لپٹتی جاتی۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ، پلکوں پر پڑے ہوئے آنسوؤں کے پیچھے اُنہیں ایک ایسی تصویر دکھائی دیتی۔

جس میں ان کی زندگی کے شدید گناہوں کا عکس ہوتا اور تب وہ بے چین ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔

پھر وہاں کی بدستور تنہائی ہوتی، بے زبان خاموش ہوتی۔ اس جلتی ہوئی خاموشی کی آگ کو بجھانے کے لیے اُنہیں شراب کے چھینٹوں کا سہارا لینا پڑتا تا آن کے اندر اس اچانک تبدیلی کا آجانا۔ گاؤں والوں کے لیے حیرت و استعجاب کی بات تھی۔

محل کے سپاہیوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ نواب صاحب کے اوپر کسی چڑیل یا روح کا سایہ پڑ گیا ہے۔ صبح کا وقت تھا دھوپ میں کچھ تمازت تھی۔ لیکن موسم بہار ہونے کی وجہ سے ہوائیں خوشگوار لگ رہی تھیں۔ ریشمی کرتے پاجامے میں ملبوس وہ لان میں نکل آئے۔ محل کا یہ بڑا لان معطر سا تھا۔ چہار دیواری سے کچھ ہٹ کر مہندی کی کیاریاں تھیں۔ کیاریوں کے درمیان لہلہاتے پودے اور رنگین تتلیاں۔ اِدھر اُدھر پھدک رہی تھیں۔ ننھے ننھے پنچھی گھاس پہ اُتر کر بلا اجازت کیڑے مکوڑے چگ رہے تھے اشوک کے درخت کے سائے میں ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ وہ اس پر جا بیٹھے۔ ایک سپاہی نے لپک کر اُن کے قدموں تلے ایک تپائی رکھ دی۔ تو اُنہوں نے اس پہ پاؤں پھیلائے۔

دوسرا نوکر اندر سے کچھ میگزین اور تازہ اخبار لے آیا۔ ایک بید کی میز اُن کے قریب لا کر اُس پر اُس نے میگزین اور اخبار رکھے۔ تو انہوں نے لاپرواہی سے گردن گھما کر اخباروں کی جلی سرخیوں کو دیکھا۔ ایک اخبار میں محمد علی جناحؒ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

"ملک آزاد ہونے والا ہے ——"

لیکن اُنہوں نے اخبار اُٹھایا نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ آباؤ اجداد کی ملک کے لیے کی جانے والی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ دہنا یا بایاں ہاتھ گود میں رکھ کر وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں

سے چاندی کی انگوٹھی کو گھمانے لگے۔ جو انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں
پہن رکھی تھی۔

انگوٹھی چاندی کی تھی۔

پھر بھی ان کی انگلیوں میں دیگر ہیرے کی انگوٹھیوں سے زیادہ قیمت رکھتی
تھی۔ انگوٹھی پر نقش کیا ہوا معزلہ کا نام انہوں نے چوم لیا۔ تبھی وہاں جمیل آگیا
جس دن سے نواب ارجمند نے اس کی بہن کو طلب کر کے اس کے احساس کو ٹھ
پہنچائی تھی۔ وہ اس درجے نادم تھا کہ ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے میں بھی اسے
تکلیف ہوتی تھی اس طرح جیسے اُس نے خود ہی اپنی بہن کو ان کے سپرد کرنے کی
کوشش کی ہو اور اُنھوں نے انکار کر دیا ہو۔

نواب ارجمند نے اُسے سمجھایا تھا کہ اُس کی بہن خود ان کی بہن ہے تو وہ
سے زمین میں گڑ گیا تھا ۔۔۔

---

نواب ارجمند نے اسے اپنا ایک فرض سمجھ کر اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے
س کو کہا تھا کہ وہ اپنی بہن کی شادی اس علاقے میں ایسی شان و شوکت سے
گے کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔ لڑکا جیسا بھی ہو۔ لیکن چال چلن اچھا
نا چاہیئے۔

پھر وہ اپنی دولت کے ذریعے اس کی تمام کمیوں کو پورا کر دیں گے اور تب
ہ جمیل کا دل فرط مسرت سے بے قابو ہو گیا تھا۔ دل چاہا تھا کہ وہ جھک
ب کے قدم چوم لے۔ ندیمہ اُس نے اپنی بہن کا نام پیار سے پکارا تھا۔
کتنی خوش نصیب ہے کتنی خوش نصیب ہے ندیمہ!

نواب صاحب! ۔۔۔ وہ ادب سے جھک کر بولا ۔۔۔ آج کئی دن سے
ونا پڑا ہے۔ آپ کا مزاج بھی ٹھیک نہیں رہتا۔ اس بات سے ہمیں ہی

نہیں ساری رعایا کو دکھ ہے۔ نواب ارجمند نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں
بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔
"مزلہ کا کچھ پتہ چلا!"
"جی ہاں نواب صاحب!" جمیل نے کہا۔ "سنا ہے
پاس والے گاؤں میں وہ اپنے بابا کے ساتھ ایک مکان میں رہتی ہے۔"
"سنا ہے یا دیکھا ہے!"
"گھبرائیے نہیں جناب! ہم خود پرسوں جا کر اس کا ٹھیک پتہ لگا
"پرسوں کیوں؟"
نواب ارجمند نے اسے تعجب سے دیکھا "آج کیوں نہیں؟" ار
کیوں نہیں؟"
"کل چوہدری احمد خاں معہ اپنے خاندان کے یہاں تشریف لا
ہیں۔ آخر ان کے استقبال کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں۔"
"جمیل!" نواب ارجمند اچانک ہی کھڑے ہو گئے کچھ اس
جیسے جمیل نے کوئی غلط بات کہی ہو۔
"ایک لڑکی کے غم میں آپ اپنے فرض کو بھول گئے۔" جمیل
کہا۔ "کل سولہ تاریخ ہے ابھی کچھ دن ہوئے صبحان پور کے چو
خاں کو اپنے محل میں آنے کی آپ ہی نے دعوت دی تھی۔ تاکہ منگنی کی

اور آپ کے والدین کی روح کو تسکین حاصل ہو سکے۔"
"ہاں!" نواب ارجمند بہت سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "لیکن تم
بھول گئے۔ اسی سفر سے لوٹتے وقت ہم نے پہلی بار مزلہ کو دیکھا تھا اور
کے بعد ہی میرے دل کی دنیا بدل گئی۔ میرے خیالات میرے ارادوں میں
آگیا ہے۔
"میں سمجھا نہیں نواب صاحب آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" جمیل نے
سے پوچھا!
"اب یہ منگنی نہیں ہوگی!" نواب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"لیکن جناب!" جمیل نے پھر کہنا چاہا۔
"میں نے کہا! اب یہ منگنی کبھی نہ ہوگی!"
"لیکن جناب اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تو محل کی طرف چل
پڑے ہوں گے۔ اس کے علاوہ شہر کے کلکٹر، کمشنر اور ان سب لوگوں
کو جنہیں دعوت نامے جاری ہو چکے ہیں۔"
"جمیل!" نواب قریب قریب چیخ اٹھے۔ "تم نے ہمیں یہ
میں بہت دیر کر دی۔ کیا ہم جان سکتے ہیں کہ اس کے پس پردہ کونسی
پوشیدہ ہے!"
"صاحب! آپ نے ہماری زندگی کی لہر کو بدل دیا ہے۔ اسی لیے ہم

چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی کا یہ سونا پن بھی دور ہو جائے اس محل میں کوئی
کر آئے تاکہ یہاں کی نوکرانیوں کو خدمت گذاری کا موقع دستیاب
جب سے آپ نے خاموشی اختیار کی ہے کسی کے پاس کوئی کام ہی نہ
آپ کے محل کی رونق واپس آجائے تو ہمیں ہی نہیں ساری رعایا کو
سکون حاصل ہو گا۔ ہم جانتے تھے کہ اگر وقت سے پہلے آپ کو یہ بات
گئی تو آپ منگنی کرنے سے انکار کر دیں گے اسی لیے ہم نے ایسے کسی
گنجائش ہی نہیں رکھی ——"

"اُف! ——" نواب صاحب نے برگشتگی کے انداز میں
اپنا ہاتھ جھٹکا —— "تم نے مجھے ایک مصیبت میں ڈال دیا اگر تمہاری
ہوتا تو میں اسے گولی مار دیتا ——"

جمیل زیر لب مسکرایا۔

اسے امید کی ایک جھلک نظر آئی، نواب صاحب کی منگنی ہو گئی
خیال کسی حد تک ان کے ذہن سے محو ہو جائے گا۔ نواب جیسے خوش
سرو قد جسم اور گوری چٹی شخصیت کے نوجوان کے لیے کسی نواب
لڑکی کی ہی ضرورت ہے۔ گاؤں کی گندی گوری کی نہیں۔ نواب کو
چھوڑ کر جمیل محل میں داخل ہو گیا۔

کیونکہ اسے فوراً ہی مہمانوں کی تعداد کے مطابق طعام و قیام کا



کرنا تھا۔ اس تمام رات نواب صاحب بہت پریشان رہے ایک پل بھی چین نصیب نہ ہوا۔ وہ منگنی سے انکار کر دیتے اگر انہیں مزلہ کی طرف سے امید ہوتی —— ان کے والد صاحب نے سب کچھ پہلے سے طے کر رکھا تھا۔ انہوں نے احمد خاں سے دوستی کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ایسا کیا تھا ——

صبح کے آثار نمودار ہوئے تو وہ باہر نکل آئے پھر ایک خیال نے برق رفتار کے ساتھ انہیں کپڑے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر گاؤں سے باہر نکل آئے۔ احمد نگر نزدیک آگیا۔ ایک ٹیلے پر چڑھ کر انہوں نے دور تک دیکھا۔

گاؤں کا سارا نظارہ ان کے سامنے تھا۔

گھوڑے سے اتر کر وہ لگام تھامے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ تبھی گھوڑے کی ٹاپ سن کر ایک خوبصورت لڑکی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو قدم ڈگمگا گئے۔ جسم کانپ گیا سر پر جو گھڑا تھا وہ گر گیا —— وہ مزلہ تھی —— مزلہ نے کہا۔

نواب ارجمند یہاں اس وقت! —— کمبخت یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا جانے کیوں اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔ لیکن تب تک نواب ارجمند اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"مزلہ!" انہوں نے پُر درد لہجے میں کہا —— "کیا تم اب بھی مجھے معاف نہیں

کرو گی۔ تمہاری ہی تلاش میں نکلا تھا۔ آؤ چلو میرے ساتھ ــــ"

انہوں نے ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور مزلہ انہیں بہت حیرت سے دیکھنے لگی۔ لاپرواہی سے پہنا ہوا کرتہ پاجامہ تر ہو کر ان کے گورے بدن سے چپک گیا تھا۔ الجھے ہوئے گھنے بال جیسے خواب سے اٹھ کر چلے آئے ہوں پیشانی پر آ نہیں پورے چہرے پر پسینے کی موٹی موٹی بوندیں منجمد ہو گئی تھیں۔ گلے کے ہار اور کانوں کے بندوں پر یہ موتی کی طرح چمک رہی تھیں آنکھ میں گہری اداسی ہونٹوں پر سچی توبہ کی پکار اس کے دل کو ایک سچے سکون اور آسودہ مسرت کا احساس ہوا۔ کریم نگر کے علاقے کا نواب اپنا محل چھوڑ کر گار کی گودی کی کٹیا پر بھیک مانگنے آیا ہے۔ معافی کا طالب ہے بھکاری ہے۔

نواب ارجمند بھکاری ہے ــــ

اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے ہنس پڑے زور سے قہقہے لگانے لگے۔ چلا چلا کر دنیا کو بتائے کہ دیکھو ایک غریب اور لاچار عورت کی آہ نے کیا دکھایا ہے۔ ایک نواب تڑپ رہا ہے محبت کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ جلا ہے ــــ اور جلتا رہے گا۔ جب تک کہ یہ محبت کی آگ اسے جلا کر بھسم نہ راکھ نہ کر دے۔

یہ نواب نہیں رہے گا۔ اس کا راج نہیں رہے گا۔ ایک دن اس کا محل ملبہ ہو کر پاش پاش ہو جائے گا۔ آہاہاہاہا ــ مگر وہ ایسا نہیں کر سکی۔ دل

ایک انجانی طاقت نے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں اداس ہو گئیں دل پر جیسے آرے چل رہے تھے۔ اس کی خاموشی نے نواب ارجمند کی ہمت کو اکسایا۔ اس کی خاموشی کے پیچھے انہوں نے اپنے حق میں ہمدردی کا جذبہ پنہاں دیکھا تو انہوں نے کہا۔

"آج میری منگنی کا دن ہے۔ ایک نوابی خاندان کی لڑکی کے ساتھ! لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں لے جا کر کھڑا کر دوں سب کو گواہ بنا کر تمہارا ہاتھ تھام لوں مزلہ میں تمہیں ہی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔" مزلہ تب بھی کچھ نہ بولی۔ اس نے نواب ارجمند کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا یہ ممکن ہے؟ ــــ"

ایک ایسا نواب جس کے لیے لڑکیاں صرف کھیل تماشہ ہی رہی ہوں۔ خوبصورت دوشیزائیں جس کے ہاتھوں میں کھلونا بنتی رہی ہوں۔ وہ ایک معمولی اور غریب لڑکی سے محبت کرے گا؟ کیا وہ اسے اپنی شریک حیات بنا سکتا ہے؟

"میرا یقین کرو مزلہ!" نواب ارجمند نے پھر کہا۔ "میں اپنے باپ دادا کی مثال نہیں ہوں۔ جو شادی کے بعد بھی دوسری لڑکیوں سے لطف اندوز ہونے میں اپنی شان سمجھوں۔ تم چاہو گی تو میں اپنی ساری جائیداد اور اپنا سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ جہاں چاہو گی تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا۔ صرف مجھے

معاف کر دو ا ـــــ معاف کر کے مجھے اپنا بنا لو مزلہ ا ـــــ "

اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی ـــــ آنکھیں بھیگ گئیں۔ معافی کی طلب

حقیقتاً اُنھوں نے اپنے ہاتھ اُس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔ مزلہ نے

اُن کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی اُنگلیوں میں بیش بہا ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں

لیکن ان کے ساتھ ایک انگوٹھی چاندی کی بھی ہے۔ بائیں ہاتھ کی

انگلی میں جس پہ اُس کا نام نقش ہے۔ مزلہ ا ـــــ

اُسے سخت حیرت ہوئی۔

" یہ انگوٹھی تب ہی میری انگلی سے اُترے گی جب تم مجھے معاف کر دو "

اُنھوں نے مزلہ کی نظر بھانپ کر از خود کہا۔

" اور جب اُسے واپس لے کر تم اپنی انگلی میں پہن لو گی تو میں سمجھوں

کہ تمہارے دل میں میرے لیے محبت کا مقام بن گیا ہے ـــــ بائیں ہاتھ

انگلی میں میں نے اسے اس لیے پہنا ہے۔ کیونکہ میرا بھی سیدھا ہاتھ

اسی ہاتھ سے میں سارے کام کرتا ہوں۔ اسی لیے اس انگوٹھی کو بھی یہ اع

دے رکھا ہے تمہارے باقی گہنے بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ میری نظر

میں تم فرشتے سے بھی زیادہ پاکیزہ ہو۔

مزلہ نے اپنی بڑھی گھنی پلکوں کی جھالر جھکا لی۔ نواب ارجمند کو جرأ

ایک اور کڑی ملی ـــــ

---



گھٹنے کے بل جھکتے ہوئے انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ سے اُس کی پشت کی

طرف سے اُس کا بازو تھام لیا اور بائیں ہاتھ سے اُس کے دائیں ہاتھ کو ہتھیلی پر

پھول کی طرح رکھ لیا۔

پھر پلکوں کی جھولی اس کے آگے پھیلا کر بولے۔

" مزلہ مجھے معاف کر دو ا ـــــ "

ان کی آواز پہلے سے بھی زیادہ ہلکی ہو گئی تھی۔ مزلہ کے لب کانپ گئے جانے

کونسی ایسی بات تھی جس کے سبب نواب ارجمند سے نفرت کرنے کے باوجود

دل پر نشتر سے چل گئے۔ پلکوں پر ٹھہرے اشکوں کے موٹے موٹے آنسو موتیوں

کی لڑی بن کر رخساروں سے ڈھلک گئے۔

پھر ہوا کا دامن تھام کر نواب ارجمند کی آنکھوں کا ہار بن گئے۔

"اس سنسار میں ہر چیز حالات کی غلام ہے مزلہ"

نواب ارجمند نے پھر کہا۔

"اور ان ہی حالات کا شکار ہونے کے بعد میں بھی اپنے باپ داداؤں کی ایک کڑی بن کر دوسروں پر جو ستم ڈھاتا چلا گیا۔ یہ بھی حالات کا تقاضہ ہے کہ آج میں تمہاری محبت کا محتاج ہوں — تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں — اگر تم شروع ہی سے مجھ سے نفرت نہ کرتیں تو شاید میری دیوانگی اس حد تک نہ بڑھتی اب تم نے مجھے زندگی کی ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اس لیے آپ تم اس نئی راہ پر میرا ساتھ دو —"

مزلہ کے لبوں پر ایک سسکی ابھرنے کو تڑپ اٹھی۔ وہاں اچانک ہی ایک زخمی باز آگیا تھا۔ جو اڑ نہیں سکتا تھا۔ صرف پھڑپھڑاتے ہوئے پروں کے بل چل کر شاید وہ پناہ لینے کی جگہ تلاش کر لینا چاہتا تھا۔

دفعتاً بچوں کے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پتھراؤ کرتے ہوئے وہ باز کا تعاقب کر رہے تھے مزلہ نے گھبرا کر اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ بھیگی ہوئی ہرنی کی طرح وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ نواب ارجمند کو اپنی بات کا جواب مل چکا تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھے رہ گئے۔

مزلہ ٹیلے سے نیچے اتر کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ لگائی۔ دور چھوٹے چھوٹے بچے انہیں تعجب



سے دیکھ رہے تھے۔ جس وقت نواب ارجمند حویلی پہنچے۔

تو شام ہو چکی تھی۔ ان کے دل میں یہ بات سما چکی تھی۔ کہ وہ کوشش کر کے مزلہ سے معافی مانگ سکتے ہیں اور اسے اپنا بنا سکتے ہیں اس اعتماد کی بدولت اب وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔

حویلی کا لان کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ مہمان پریشانی کی حالت میں ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے جیسے ہی نواب ارجمند نے ہال میں قدم رکھا سب خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ چند ایک نے مسکرا کر خیر مقدم بھی کیا۔ نواب صاحب نے دیکھا۔ ایک طرف احمد خاں معہ اپنے خاندان کے بیٹھے ہوئے ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے ان کی بڑی لڑکی جمیلہ بھی ان کے ساتھ بڑی سج دھج کر بیٹھی ہوئی تھی نواب ارجمند نے ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔

اور وہ چلتے ہوئے بالائی کمرے میں پہنچے احمد خاں سے ملاقات کئے بغیر — چوہدری احمد خاں کو یہ بات بہت ناگوار گذری انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے نواب ارجمند نے بھری محفل میں ان کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔

وہ خاموش رہ گئے۔ لیکن جمیلہ برداشت نہ کر سکی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچی اسے جاتا دیکھ کر اس کے والدین اور بھائی بھی پیچھے پیچھے اوپر چلے آئے۔ نواب ارجمند شیشے کے گلاس میں جام بھر رہے تھے۔ جمیلہ اور اس کے گھر کے لوگوں کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بھی خاموش

رہے اور شراب پینے میں بھی کچھ پس و پیش نہیں کیا۔

"ارجمند!" ـــ وہ یکایک بولی۔ ان کی ہم عمر ہونے کے سبب وہ انہیں ارجمند کے نام سے ہی مخاطب ہوتی تھی ـــ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ابا جی کے سامنے تمہیں شراب پیتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ ـــ"

لیکن نواب نے کوئی پرواہ نہ کی گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ چوہدری احمد خاں نے اسے گھور کر دیکھا۔

ان کی بیگم نے بھی نفرت سے منہ پھیر لیا۔ بھائیوں کی بھی مٹھیاں سخت ہو گئیں۔ لیکن نواب نے کوئی پریشانی ظاہر نہ کی انہوں نے پھر جام بھرا اور چاہا کہ ہونٹوں سے لگا لیں کہ جمیلہ نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن نواب نے بہت تیزی سے اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے مت روکو! میں تمہارے ساتھ منگنی سے انکار کرنے کی ہمت جمع کر رہا ہوں ـــ"

"ارجمند! ـــ" جمیلہ کے پیروں تلے کی زمین سرک گئی۔

"ہاں جمیلہ! میں مجبور ہوں! ـــ" نواب نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"نہیں ـــ نہیں ـــ ایسا نہیں ہو سکتا ـــ" جمیلہ زور سے چیخی۔

"ارجمند ـــ" چوہدری احمد خاں نے بھی مخالفت کرنا چاہی۔

"چوہدری صاحب! میں مجبور ہوں! یہ منگنی نہیں ہو سکتی۔ آج صبح تک ہو



سکتی تھی لیکن اب نہیں ہو سکتی۔

"لیکن یہ رشتہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے! ـــ" چوہدری احمد خاں نے کہا۔

رشتہ طے کرنے والے اب اس دنیا میں نہیں رہے ـــ چوہدری صاحب! ـــ اس وقت میں بہرا اور اندھا تھا۔ میں کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ غریبوں کی کسی قسم کی چیخ و پکار کو سن نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج میری آنکھیں کھل چکی ہیں اور سب کچھ سن رہا ہوں اب میں یہ شادی کبھی نہیں کر سکتا۔"

چوہدری احمد خاں سبحان پور کے بگڑے ہوئے زمیندار تھے اپنی جھوٹی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی دولت پانی کی طرح بہاتے رہے اور دوسرے بڑے زمینداروں سے قرضہ لیتے رہے۔ رفتہ رفتہ قرضہ اتنا بڑھ گیا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا سوائے اس ایک راستے کے کہ وہ اپنی بڑی بیٹی جمیلہ کی شادی نواب ارجمند کے ساتھ کر دیں یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ نواب ارجمند کے والد نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ نواب احمد جانتے تھے بیٹی کی شادی کر کے ہی وہ اپنی جھوٹی شان و شوکت قائم رکھ سکتے تھے۔

کیونکہ نواب ارجمند کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ بیٹی اپنے باپ کی عزت کی خاطر ان کی ضرور مدد کرتی لیکن جب اچانک ان کی امیدوں کے برخلاف انہوں نے نواب سے انکار سنا تو ان کا دل ٹوٹ گیا۔

چوہدری احمد خاں نے اس انکار کو اپنی توہین سمجھا۔ انہوں نے چاہا بھی کہ

سمجھا بجھا کر نواب کو راضی کر لیں لیکن عام و معزز مہمان اوپر آ چکے تھے جن میں ان
کا معتبر سیکریٹری جمیل بھی تھا۔

جھولی پھیلا کر بھیک مانگنا ان کے شایان شان نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے
اس انکار کا سبب جاننا ضروری سمجھا۔ ”ہم پوچھ سکتے ہیں اس انکار کی وجہ کیا
ہے“ انہوں نے نواب ارجمند سے پوچھا۔

”مجھے مزلہ سے محبت ہو گئی ہے!——“

”محبت!——“

”کس مزلہ سے!——“

جمیلہ برداشت نہ کر سکی اور بیچ میں بول پڑی۔

”ہے ایک اسی گاؤں کی لڑکی!!——“

نواب نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

”اس پر میں نے ظلم کیا ہے —— اسے لوٹا ہے ——“

”اس سے تو نوابوں کی شان میں چار چاند لگتے ہیں ——“ چوہدری نے ر
پھیلا کر کہا——

”نہیں ——“ نواب ارجمند زور سے بولا —— ”اس سے نوابوں
خلاف غریب عوام میں نفرت کا جذبہ بڑھتا ہے اگر وہ مجھ سے نفرت نہ
تو میں ہمیشہ اندھا رہتا اور دوسروں پر ظلم کرتا رہتا۔ لیکن مزلہ نے میری آ



کھول دیں ——“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ گاؤں کی ایک معمولی لڑکی تمہاری شریک حیات
بنے گی ——“ چوہدری احمد خاں نے طنزیہ کہا۔

”یقیناً!——“

”اور وہ اس حویلی میں ٹھاٹ سے رہے گی!!——“

”ہر حالت میں!!——“

نواب ارجمند نے چوہدری احمد خاں کو دیکھا۔ جو غصے سے تھر تھرا رہے تھے۔
جمیلہ کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ قریب کھڑے ہوئے ناجائز بیوی کے لڑکوں
کی مٹھیاں سخت ہو رہی تھیں۔

”ارجمند!——“

اچانک چوہدری احمد خاں نے غصے سے پیچ و تاب کھا کر کہا۔

”تمہیں اس توہین کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا——“

”کتنی دولت چاہیئے؟——“

نواب ارجمند نے جام بھرتے ہوئے لاپرواہی سے دریافت کیا۔

چوہدری کو محسوس ہوا جیسے بھرے دربار میں اس نے انہیں ننگا کر دیا ہے۔ وہ
ہونٹ کاٹ کر غصے میں بولے —— ”ہم کسی سے بھیک نہیں مانگتے ——“

”مجھے معلوم ہے“ نواب ارجمند نے کہا——

آپ ہی نہیں میرے باپ دادا بھی کسی سے بھیک نہیں لیتے تھے بلکہ معصوم لوگوں کی زندگیاں چھین لیا کرتے تھے ———"

---



"ارجمند! ———"

چوہدری احمد خاں نے زور سے چیخ کر کہا۔

"جمیل!" ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نواب ارجمند نے بھی چیخ کر کہا۔ "ان کے لیے خزانے کا منہ کھول دو! ———"

چوہدری احمد خاں آگ بگولہ ہو گئے۔ اب ان کا یہاں رکنا سخت توہین تھا۔

انہوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا۔ بیٹیوں کو گھور کر دیکھا۔

اور ارجمند کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ارجمند ہمارا نام بھی چوہدری احمد خاں ہے ایک دن میں اس توہین کا بدلہ لے کر ہی رہوں گا۔" چوہدری احمد خاں مع اپنے خاندان کے بہت تیزی سے باہر

نکل گئے۔

نواب ارجمند خاموش رہے۔ احمد خاں کی باتوں کو ان سنی کرتے ہوئے ایک
غلط نگاہ سے اُن کو جاتے ہوئے دیکھا۔

پھر اچانک پلٹے۔ مہمان کھڑے ہوئے ان کے حکم کے منتظر تھے ــــ

"معزز مہمانوں! ــــ" اُنہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس پارٹی پر
تشریف لانے سے آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے۔ اس کے لیے میں معافی چا
ہوں۔ آئیے ہم پارٹی شروع کریں۔ نیچے اور بھی مہمان ہمارے منتظر ہیں!۔

"چیئرز، چیئرز، چیئرز! ــــ"

کئی جام جاموں سے ٹکرائے چیئرز! کئی آوازیں ایک ساتھ ہال میں اُبھریں
چیئرز مہمانوں نے دل کھول کر لطف اٹھایا۔ اُس رات کی پارٹی بہت شاندار
بہت دیر تک رونق رہی ــــ تمام مہمان اُس خوش قسمت لڑکی کے متعلق
رہے تھے جو نواب ارجمند کی شریک حیات بن رہی تھی۔

اب جب بہت دیر بعد سب مہمان رخصت ہو گئے۔

ہال نوکروں سے خالی ہو گیا۔

تو نواب ارجمند ہاتھ میں جام لیے ایک بڑے آئینے کے مقابل جا کھڑے
ہوئے۔ اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ہا ہا ہا ــــ"

اُن کی آواز حویلی کے کونے کونے میں گونج اٹھی ــــ



"کیا بات ہے نواب صاحب آج آپ بہت خوش ہیں؟ ــــ"

جمیل نے اپنا جام خالی کیا اور نزدیک آ کر پوچھا۔

"جمیل آج میں واقعی بہت خوش ہوں۔ بے حد خوش آج تم جو بھی چیز
مانگو گے تمہیں ضرور ہی دی جائے گی ــــ"

"آپ مجھے ... اپنی خوشی میں شاہی خدمت کا اعزاز بخش دیں ــــ"

"جمیل! ــــ" جمیل کے اس جواب پر اُن کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا
انہوں نے اُس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر تم اس خوشی میں شامل نہ ہو گے تو اور کون ہو گا؟ ــــ تم میرے صرف
دوست ہی نہیں میرے بھائی بھی ہیں جس پر مجھے مکمل اعتماد ہے ــــ" پھر
نواب ارجمند نے جمیل کو ساری رام کہانی سنائی جسے وہ بڑی توجہ سے
سنتا رہا۔

اُنہوں نے اُسے بتایا کہ مزلہ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ شاید وہ مجھے
اپنا بنائے گی ــــ" جمیل نے دل ہی دل میں مزلہ کی محبت پر رشک کیا نواب
ارجمند کچھ بھی بن جائیں لیکن ہیں تو نواب ہی ایک بڑی جاگیر کے تنہا مالک ایسے
شخص کی شریک زندگی بن کر وہ خود کو دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب عورت
سمجھے گی۔

رات کا سناٹا ابھی گاؤں کے شور سے درہم برہم تھا۔ ریل گاڑی اندھیر

کا سینہ چاک کرتی جارہی تھی۔

تیسرے درجے کے کمپارٹمنٹ میں ایک بوڑھا اپنی بیٹی کے نزدیک بیٹھا ہوا بہت خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ بیٹی کو ہلکا سا بخار تھا۔ کمپارٹمنٹ میں جگہ کم تھی اور مسافر زیادہ اس لیے وہ اپنی بیٹی کو لے کر ایک کمرے میں فرش پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

اُس کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ پیسے ہی نہیں تھے ٹکٹ کہاں سے لیتا وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا اچانک دھرتی پر زلزلہ سا آگیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات ڈگمگا گئی ہو۔ اوپر برتھ پر رکھے ہوئے ٹرنک نیچے آ پڑے کمپارٹمنٹ میں ایک واویلا مچ گیا۔ بوڑھے بابا کا سر ایک ٹرنک سے بڑی زور سے ٹکرایا۔ اُس کی بیٹی نیچے لڑھک گئی۔ وہ دونوں بے ہوش ہو چکے تھے۔

لیکن کچھ دیر بعد لڑکی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس کے کانوں میں لوگوں کے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔ گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی چاندنی تھی جس کی روشنی میں وہ کسی حد تک سب کچھ دیکھ سکتی تھی اس کے سر میں سخت درد تھا۔

لڑکی کی ساڑھی خون سے زخمی اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے با



تصویر لہرائی تو اُس نے چاروں طرف نظر گھما کر بابا کو تلاش کرنا چاہا۔ جو ایک کونے میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنی تمام قوتِ ارادہ کو جمع کرتے ہوئے اپنے بابا کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور چیخ پڑی !۔۔۔

"بابا !۔۔۔ بابا !۔۔۔"

اُس کے بابا نے آنکھیں کھول دیں ہونٹوں پر ایک کراہ لرز گئی وہ خود ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مسافر ابھی تک سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے ۔۔۔ وہ بھی گھبراہٹ میں آگے بڑھے تو دیکھا کہ درمیان کی تین لوگیاں پٹڑی سے اُتر چکی ہیں۔

آگ کی روشنی اور شعلے اب گاڑی سے نکل کر فضا میں بکھر رہے ہیں رات کے اس سناٹے میں شہر سے کوسوں دور ریل کا یہ حادثہ ایک ہیبتناک منظر پیش کر رہا تھا۔ لوگ دوڑ دوڑ کر اور آوازیں دے دے کر عزیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کہ

دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر مسافر بوکھلائے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے جس کو جہاں جگہ ملی چھپ گیا۔ بابا نے اپنی بیٹی کو سینے میں چھپا لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کچھ ڈاکو مسافروں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ جو پہلے ہی زندہ درگور ہو رہے تھے۔

جس کسی کے پاس بھی کوئی قیمتی چیز ملی چھین لی۔ زیورات گھڑیاں روپے پیسہ سب کچھ چھین لیا۔ چند ایک نے ہمت کر کے مقابلہ کرنا چاہا تو ڈاکوؤں کی گولیوں کے سامنے ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ ایک تندرست ادھیڑ شخص ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے کرتے گھائل ہو کر ان کے قریب آ گرا۔

ڈاکوؤں کے جاتے ہی بابا نے زخمی کی مدد کرنا چاہی۔ اسی وقت ایک خوبصورت لڑکی آکر اس شخص کی چھاتی سے لپٹ گئی۔

"ابا جان ابا جان!—"

وہ زور سے چیخی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بابا اپنی بیٹی کو لیے اس کے نزدیک چلا آیا۔

اس نے چاندنی میں دیکھا گھائل شخص کوئی بڑا آدمی تھا۔ شاید کوئی زمیندار یا جاگیردار۔

"ہم آپ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟—" بابا نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

لڑکی نے سر اٹھا کر بوڑھے بابا کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

"کیا یہاں کہیں پانی مل سکتا ہے تھوڑا سا ہی مل جائے—"

"مزلہ بیٹی!—" بابا نے اپنے پاس کھڑی ہوئی لڑکی کو مخاطب کر کے کہا۔



"تو یہیں ٹھہریں ابھی آیا—" اور پھر وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

مزلہ اپنے زخموں کو بھول کر وہیں بیٹھ گئی۔ اور اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگی جو پریشانی اور مایوسی کی زندہ تصویر تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد بابا پانی کی ایک صراحی لیے ہوئے واپس آ گیا جانے یہ کس مسافر کی اٹھا لایا تھا۔ لڑکی نے احسان مندی کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے صراحی لے کر اپنے باپ کے چہرے پر تھوڑا سا پانی چھڑکا کچھ دیر بعد انہیں ہوش آ گیا۔

انھوں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے قریب کھڑے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ مزلہ ان کے سرہانے بیٹھی تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر انہیں سہارا دیا۔ ان کی اپنی لڑکی نے صراحی اپنے باپ کی طرف بڑھا دی اور وہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کتنے گھونٹ پانی پی گیا—

"جمیلہ بیٹی!—"

صراحی ہونٹوں سے الگ کر کے وہ ہانپتے ہوئے بولے۔

"کمبخت نجومی نے جانے کیوں چلتے وقت اس بات کا یقین دلایا تھا کہ ہمارا سفر مبارک وقت پر شروع ہو رہا ہے وہاں بھی لینے کے دینے پڑ گئے اور یہاں بھی جان پر آ بنی۔

شور و غل اب تک مچا ہوا تھا۔

لوگوں کے بہت سے رشتے دار اُن سے آن ملے تھے لوگ زیادہ مرے نہ تھے۔ لیکن زخمیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ فائر بریگیڈ والوں نے آگ پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

بابا تھوڑی دیر اُس آدمی کے پاس بیٹھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بولا

”وہ کہاں جا رہے ہو بابا تم ——“ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا شاید ڈاکوؤں نے اس جگہ وار کیا تھا۔ اپنی باتوں سے شاید وہ ایک چھوٹے آدمی کا احسان اُتار رہے تھے۔

”ابھی تک تو کوئی منزل ہی نہیں بنائی سرکار“! بابا نے چوہدری احمد کی شخصیت کا اندازہ لگا کر جواب دیا۔

---



چوہدری احمد خاں نے اُسے اور اس کی بیٹی کو غور سے دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے گدڑی میں لعل چھپا ہو بڑی بڑی سیاہ پلکوں کے پیچھے آنکھوں میں غیر معمولی مقناطیسیت تھی۔ ایسی چمک جو ان کی آنکھوں میں تھی انہوں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔

احمد خاں نے جن نظروں سے مزلہ کو دیکھا۔ وہ ان کی چبھن محسوس کئے بنا نہ رہ سکی وہ جانتی تھی کہ یہ بڑے بڑے جاگیردار ہمیشہ خوبصورتی کے رسیا ہیں —— غریب کو اپنی عزت کی حفاظت کرنا بھی مشکل ہے وہ گھبرائی ہوئی ہرنی کی صورت میں وہاں سے ہٹ جانے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہ میری لڑکی ہے۔ میری پوتی ——“ بوڑھے بابا نے کہا۔

”ہوں! —— اوہ! ——“

احمد خاں کو اپنی لڑکی کی موجودگی کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً اپنی نگاہ کا زاویہ بدل دیا، پوچھا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟——"

"رہنے والا تو کریم نگر کا ہوں لیکن آ رہا ہوں احمد نگر سے ——" بابا نے جواب دیا۔

"کریم نگر!——" چوہدری احمد خاں نے تعجب سے دیکھا۔ کریم نگر نام سے انہیں نفرت ہو گئی تھی۔ جمیلہ نے بھی اُسے دیکھا۔ پھر مزلہ کو بھی۔

"کریم نگر کیوں چھوڑ دیا ہے؟——"

"وہاں کے ظالم نواب سے تنگ آ کر——" بابا بولا —— "وہ میری بیٹی کو اٹھا لے گیا تھا اور پھر اسے کہیں کا نہ رکھا——"

جمیلہ نے مزلہ کو بہت غور سے دیکھا۔ خود اتنی خوبصورت ہونے کے باوجود مزلہ کے خدوخال میں غیر معمولی کشش دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اس کے بھائیوں نے بھی مزلہ کو بغور دیکھا۔ جو کہ اپنے باپ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔

شرم سے مزلہ نے اپنی گردن جھکا لی ——

"اور پھر!——" بابا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہم اس کی نظروں سے بچ کر احمد نگر میں جا چھپے لیکن اس ظالم نے ہمارا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑا گذشتہ



دوپہر کے وقت وہ خود مزلہ سے آ کر ملا۔

"مزلہ!——"

جمیلہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ چوہدری احمد خاں اٹھ کر ٹھیک سے بیٹھ گئے۔ مزلہ ہی تو اس لڑکی کا نام ہے جس کے لیے نواب ارجمند کے یہاں ان کی ذلت ہو گئی تھی۔ کہیں یہ وہی مزلہ تو نہیں؟——

"پھر کیا ہوا؟——" تقریباً باپ بیٹی دونوں نے ایک ساتھ ہی مغلوب لہجے میں پوچھا۔

"اسے بہلا پھسلا کر وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا——" بابا نے گفتگو جاری رکھی —— "کہتا تھا وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس سے شادی کرے گا۔ ممکن ہے مزلہ دھوکے میں آ جاتی۔ لیکن جب اس نے مجھے یہ باتیں بتائیں تو میں نے اسے سمجھایا کہ نواب ایک آوارہ شخص ہے جانے کتنی معصوم لڑکیوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔ اُن معصوم لڑکیوں میں میری چھوٹی پوتی بھی شامل ہے——"

جمیلہ کے ساتھ سب ہی نے اُسے غور سے دیکھا۔

"ہاں!——" بابا کی آواز گلوگیر ہو گئی —— وہ کہتا رہا —— "اس نے میری چھوٹی پوتی کے ساتھ بھی زبردستی کی تھی —— اس نے خودکشی کر لی تھی۔ باپ نے آواز بلند کی تو اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔

"اوہ ا۔۔۔" جمیلہ کے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔

لیکن احمد خاں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شاید کسی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں تھے۔

"وہ پھر بس خاموشی سے وہاں سے نکل بھاگا۔۔۔" بابا نے پھر کہا۔۔۔ "اگر اُسے پتہ چلتا تو وہ میری بیٹی کو اغوا کرنے کے لیے دوسرا راستہ نکال لیتا۔ کمبخت جب تک مرے گا نہیں ہزاروں روحوں کو سکون نصیب نہ ہوگا۔۔۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بابا ا۔۔۔" احمد خاں نے ہونٹوں کو بھینچ کر سختی سے کہا۔ نواب ارجمند سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اب وہ اپنے منصوبے کو آخری روپ دے چکے تھے۔ اور ایسے آدمی کی موت بھی بہت بھیانک ہوتی ہے۔۔۔"

"مزلہ ا۔۔۔" معاً جمیلہ نے کہا۔۔۔ اس کے اندر کے سانپ نے چوٹ کھانے کے بعد کروٹ بدلی۔ اُسے بھی نواب سے بدلہ لینا تھا۔

"جب تمہاری کوئی منزل نہیں۔ تو تم لوگ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے تم ہمارے پاس کام کرنا۔ اس طرح تمہاری گذر اوقات بھی ہوتی رہے گی۔"

"جی ا۔۔۔" مزلہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ اس کے بابا نے بھی انکار کرنا چاہا۔ ابتدا میں احمد خاں کی نظر اُسے بھی کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔



"گھبراؤ نہیں بابا ا۔۔۔" چوہدری احمد خاں نے دل میں انتقامی جذبے کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔ مزلہ ! ہماری بیٹی کی طرح ہے ہم ان جاگیرداروں سے نہیں جو کسی کی بہو بیٹیوں پر آنکھ اٹھائیں اگر کچھ دنوں کے بعد یہاں کوئی شکایت ہوئی تو واپس آجانا۔۔۔"

چوہدری احمد خاں نے انتقامی جذبے کے تحت یہ سب کچھ کہا۔ اب وہ ان لوگوں کو نواب کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اُس کا دل مزلہ پر آگیا تھا۔ مگر اُس نے اپنی بیٹی کی موجودگی میں اپنی خواہشات کو دبا دیا۔

بابا کی آنکھیں چھلک آئیں۔ اُس نے احمد خاں کو تعریف کی نگاہوں سے دیکھا۔ ایک یہ جاگیردار تھا۔ جس نے اُنہیں اتنی عزت بخشی تھی۔ اور ایک وہ نواب تھا۔ جس نے اُن کے آشیانے کو بجلیوں کی نظر کر دیا تھا۔

بابا نے مزلہ کی طرف دیکھا۔ پھر جمیلہ کی طرف دیکھا۔

"مزلہ میری بہن کی طرح رہے گی ا۔۔۔" جمیلہ بولی۔

بابا اور مزلہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

احمد خاں، جمیلہ یا اس کے بھائیوں نے آخر تک مزلہ یا اس کے بابا پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بھی کریم نگر سے ہی آرہے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی بھی بات کر دیتے تو ان کے سارے منصوبے پر پانی پھر جاتا۔۔۔

صبح کا وقت تھا کہ ایک قافلہ احمد نگر سے کچھ فاصلے پر جا کر ٹھہرا
گھوڑوں کی بگھی۔ ٹم ٹم۔ سارے گھوڑے سفید تھے۔ جن کا رنگ دھوپ
کی شعاعوں میں دودھ کی طرح چمک رہا تھا۔ بگھی کو پھولوں سے سجایا
گیا تھا۔

چند گھوڑ سوار نگران سفید وردی میں ملبوس آگے پیچھے کھڑے تھے۔
احمد نگر سے واپسی پر انہوں نے محل میں کہا تھا کہ ان کا شاندار استقبال
کیا جائے۔

"تم لوگ یہیں انتظار کرو!۔۔۔" دور تک نظریں ڈالنے کے بعد
نواب نے اپنے قافلے کو حکم دیا۔ پھر جمیل کی طرف مڑ کر کہا۔

"تم میرے ساتھ آؤ۔۔۔"

گھوڑوں کو ایڑ لگا کر وہ دونوں آگے بڑھے ایک ٹیلے پر پہنچ کر انہوں
نے کچھ دور تک نگاہیں پھیلا دیں۔ چھوٹا سا گاؤں کل کی طرح آج بھی اپنے
معمول پر تھا۔

"کل وہ مجھے یہاں ملی تھی۔۔۔" نیچے ایک پگڈنڈی پر نظریں پھیلاتے
ہوئے نواب نے جذباتی لہجے میں کہا۔۔۔ "کل اسی جگہ میں نے اس کے
ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما تھا۔۔۔"

نواب کی بات سن کر جمیل کا دل بھر آیا۔ مزلہ کو حاصل کرنے میں اب دیر



ی لگتی تھی۔ اُس نے پوچھا۔۔۔

"نواب صاحب آپ کی ہونے والی بیگم اب کہاں ملیں گی؟۔۔۔"

"آؤ ہم پتہ لگاتے ہیں۔۔۔"

اُنہوں نے کہا۔

اور ٹیلے سے اتر کر گاؤں کی طرف بڑھ گئے۔

"وہ یہیں کہیں رہتی ہے"

جمیل ان کے پیچھے ہو لیا۔ بستی میں ہلچل مچ گئی۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی
بستی کے لوگ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر انہیں جھک جھک کر سلام
کرنے لگے۔

ایک مقام پر پہنچ کر نواب ارجمند خاں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی
تو جمیل اپنے گھوڑے سے اتر گیا ایک بوڑھا آدمی وہاں کھڑا تھا۔ وہ انہیں
بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جمیل اس کے پاس پہنچا۔

"بابا۔۔۔ یہاں کوئی مزلہ نام کی لڑکی رہتی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"مزلہ؟۔۔۔"

"ہاں!۔۔۔" اپنے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے نواب صاحب درمیان
میں بول پڑے۔

"ہاں رہتی ہے بابا۔۔۔"

"کہاں؟ —"

"مگر وہ تو یہاں سے چلے گئے! —"

"چلے گئے — کہاں؟ —" جمیل نے چونک کر کہا۔

نواب ارجمند پر بجلی سی گری۔ وہ فوراً گھوڑے سے نیچے اترے۔

"کہاں چلی گئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں۔ اپنے جانے کی انہوں نے کسی کو خبر ہی نہیں دی —"

"لیکن کل دن میں مزلہ یہیں تھی —"

"ہاں — اور کل رات ہونے سے پہلے انہوں نے چپکے سے گاؤں چھوڑ دیا۔ اس بات کا علم ہمیں کل رات تقریباً نو بجے ہوا۔ جب میری بیوی ان دونوں کے لیے روٹی لے کر گئی۔

"روٹی؟ —"

"ہاں کئی دنوں سے انہوں نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ ہم ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مزلہ کو تو بخار تھا۔ پھر بھی وہ جانے یہاں سے کیوں چلے گئے؟" اس بوڑھے نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اُف! —"

نواب ارجمند کے خرمنِ دل پر بجلی گر پڑی۔ انہوں نے ماتھا تھام لیا۔ آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔ وہ بڑبڑائے — "وہ جہاں



کہیں بھی ہوگی میں اسے ڈھونڈ لوں گا —"

اُن کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔

دن بیتتے چلے گئے — اور ان کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ آخر کار وہ دن آ گیا وہ شاندار دن — جب ملک آزاد ہو گیا۔

چودہ اگست کا تاریخی دن۔ وہ دن جو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ نوابوں راجوں مہاراجوں کا دور ختم ہوا۔ اور ایک عہد نو وجود میں آیا غریب لوگ کسانوں اور مزدوروں کو نئی زندگی ملی۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔

نواب ارجمند اپنے محل کی عقبی بالکونی پر کھڑے نیچے نہانے کے تالاب کو دیکھ رہے تھے۔ جس کی سطح پر قریب کے درختوں کا عکس لرز رہا تھا۔ آج کا دن ان کے لیے بھی با معنی تھا۔ یہ ان کی سالگرہ کا دن تھا۔

ماں باپ کی حیات میں وہ سدا انعام واکرام بانٹتے رہتے تھے۔ نواب ارجمند کو اس بات کی خوشی تھی کہ آزادی کے دور میں ہر چھوٹے بڑے کی تمیز مٹ جائے گی۔ ہر شخص کو آزادانہ زندگی بسر کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔

"جمیل —" انہوں نے پاس کھڑے ہوئے اپنے سیکریٹری سے کہا۔

"غریبوں کو کھانا اور کپڑے بانٹے جا چکے ہیں؟ —"

"جناب! —" جمیل نے کہا۔

”ہم جانتے ہیں آپ کا دل اُداس ہے پھر بھی کسی کو اس بات کا گمان نہیں ہوگا کہ وہ آپ کی سالگرہ کے انعام سے محروم ہے۔ آپ کا حکم نہیں بھی ہو تو بھی ہم اپنے فرض کی تکمیل کرتے! ___“

”جمیل! ___“

نواب ارجمند نے دور ایک تاڑ کے درخت کو دیکھتے ہوئے پوری سنجیدگی سے کہا۔ ”ملک آزاد ہو چکا ہے۔ ہم نواب نہیں رہے۔ ہماری رعایا بھی رعایا نہیں رہی اب تم بھی آزاد ہو۔ تمہاری بے لوث خدمت گزاری کے لیے ہم تمام عمر تمہارے شکر گذار رہیں گے۔ خزانہ تمہارے لیے کھلا ہے۔ تم جتنی چاہو دولت لے سکتے ہو۔ میرے دل میں تمہاری یاد ایک بھائی کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میں چاہتا ہوں جمیل۔ اب میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے کہیں دور چلا جاؤں ___

دور ___ بہت دور کیونکہ اس محل کی دیواریں اب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔“

کچھ پل تک جب نواب کو کوئی جواب نہ ملا تو وہ پیچھے پلٹے۔ انہوں نے دیکھا۔ جمیل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نواب کا دل بے چین ہو گیا۔ آگے بڑھ کر انہوں نے جمیل کے بازو تھام لیے۔

”جمیل! ___“ اُنھوں نے کہا۔



”نواب صاحب! ___“ جمیل بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ کیا ملک آزاد ہو جانے کے بعد میں اس قابل نہیں رہا کہ آپ کا سایہ بن کر میں آپ کا ساتھ دے سکوں۔ میرے پاس اب رہا بھی کیا ہے۔ ایک بہن تھی۔ سو آپ کی عنایت کے باعث اب اس کے پاس سب کچھ ہے۔ آپ نے اُسے اتنی دولت دے دی ہے۔ کہ سات پشتوں تک بھی وہ اور اس کا گھرانہ بیٹھ کر کھائے تب بھی وہ ختم نہ ہوگی۔ وہ اور اس کا شوہر آپ کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ آپ کے چلے جانے سے ان کا دل بھی ٹوٹ جائے گا وہ تصویر جسے آپ پیرس سے لائے تھے۔ جو آپ کو بے حد پسند تھی اُسے دیکھ کر وہ محسوس کرتی ہے جیسے آپ کا نیاز حاصل ہو گیا۔

”وہ تصویر اُسے بہت پسند تھی! ___“

نواب نے کہا۔

”ایک بار جب تم اسے اس کمرے میں لے کر آئے تھے تو وہ اس تصویر میں کھو سی گئی تھی اور اسی لیے میں نے وہ تصویر اُسے نذر کر دی تھی ایک وقت تھا جب میں دوسروں کی عزیز چیزیں چھین لینے میں اپنی خوشی سمجھتا تھا۔ آج دوسروں کے چین و سکون اور خوشی کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینے میں ہی حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں نواب صاحب اور اسی لیے اس نے اس تصویر کو اپنی کوٹھی

کے ڈرائینگ روم میں بالکل سامنے ہی سجا رکھا ہے ہر خط میں وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے ——"

"وہ تمہیں بھی بہت یاد کرتی ہے جمیل ——"

نواب نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"اور اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ ایک بہن کو اپنے بھائی کی قربت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

"نہیں نواب صاحب ایسا مت کیجئے۔ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا آپ مجھے ایک موقع اور دیجئے آپ کے دل کی دھڑکن کو تلاش کرنے کے لیے میں زمین و آسمان ایک کر دوں گا——"

"کچھ پتہ نہیں مزلہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ کہیں ان مظالم کے سبب جو اس پر کئے گئے، اُس نے خودکشی تو نہیں کر لی ——" انھوں نے ایک آہ بھرتے ہوئے جیسے خود سے کہا۔

"وہ زندہ ہے زندہ رہے گی ——" جمیل کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے کہا —— "خدا اتنا بے رحم نہیں جو آپ کے حال پہ نظر نہ رکھے۔ آپ یہیں رہیں اس محل میں۔ ہمارے نواب بن کر ہمیشہ ہمیشہ۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم ضرور کوئی ایسا راستہ تلاش کر لیں گے جس سے اُن کا پتہ چل جائے گا۔ ہم ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ اُن کی نفرت آپ کے لیے محبت میں تبدیل ہو جائے



گی۔ آپ ہمارے مالک ہیں وہ ہماری رانی ہوں گی۔ ملک آزاد ہو چکا ہے لیکن آپ کے خاندان کے رسم و رواج نہیں بدلیں گے۔ وہی شان و شوکت ہمیشہ قائم رہے گی تاکہ مجھے تا زندگی آپ کی خدمت گذاری کا موقع حاصل ہوتا رہے۔"

نواب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اُمید کے سہارے دنیا قائم ہے شاید مزلہ کا پتہ چل جائے۔ شاید وہ انہیں معاف کر دے۔ شاید حالات اس کے دل میں اُن کی محبت کی خوشبو پھیلا دیں۔ جمیل ٹھیک ہی کہتا ہے۔ امید ہے تو زندگی ہے۔

---

چوہدری احمد خاں کے گھر میں رہتے ہوئے انہیں آٹھ ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ چوہدری احمد خاں اور ان کی بیٹی جمیلہ کے میٹھے سلوک کے آگے مزنہ اور اس کے بابا جھک جاتے تھے۔ اس گھر میں انہیں ہر طرح کی سہولتیں تھیں جمیلہ مزنہ کو سخت چیزیں کھانے سے روک دیتی بھاری اشیاء اٹھانے سے منع کرتی، سیڑھیاں نہ چڑھنے کی تاکید کرتی۔ محنت و مشقت کے کاموں سے منع کر دیتی۔

جمیلہ نے اپنی خوش اسلوبی کے ذریعے مزنہ کے دل کا زخم ہی نہیں بلکہ اس کی پیشانی کا زخم بھی بھر دیا تھا۔ اب صرف داغ ہی باقی رہ گیا تھا جسے اکثر آئینے میں دیکھتے وقت وہ نواب کو ضرور کوستی۔

ایک رات مزنہ کی حالت تشویش کن ہو گئی تو چوہدری احمد خاں اپنی پرانی



کار میں لے کر ہسپتال پہنچے، بابا کو اس کے پاس چھوڑا اور خود واپس چلے آئے کیونکہ وہاں زیادہ دیر تک ٹھہر کر وہ دوسروں کو شکوک کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے، ان کے چال چلن کے متعلق کسی کو علم نہیں تھا۔ مزنہ جوان اور خوبصورت ہے۔ یوں بھی ان کی تین تین بیویاں تھیں ایک جائز اور دو ناجائز

تقریباً آٹھ بجے رات میں مزنہ کا دردِ زہ قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا اسے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں اپنی سسکیوں میں وہ نواب ارجمند کو یاد کر کے کوسنے لگی خدا اس ظالم پر کوئی ایسی ہی دردناک مصیبت نازل کرے جس نے اس کو اس حالت کو پہنچایا ہے

"بیٹی! ـــ" اس کا بابا اس کی ایسی حالت دیکھ کر بے قرار ہوا اٹھا۔ اس نے کہا۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں ـــ"

وہ دوڑتا ہوا ایک نرس کے پاس پہنچا ایک کرسی میں دھنسی وہ ناول پڑھ رہی تھی۔ بابا نے گڑگڑا کر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب کہاں سے ملیں گے؟ ـــ"

"اس وقت ان کی ڈیوٹی آف ہے۔"

"کوئی دوسرا ڈاکٹر نہیں ہے کیا؟ ـــ"

"نہیں ـــ"

"لیکن میری بچی کی حالت خراب ہے!"

ایک پل کے لیے تو نرس فکر مند ہو گئی۔ پھر بولی

"لیکن ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ بچہ کل صبح تک پیدا ہو گا——"

"وہ...... وہ تو آپ ہی جانیں لیکن چل کر اس کی حالت تو

کیسی تڑپ رہی ہے۔

بیچاری آہ ب——" بابا رو پڑا۔

نرس نے ایک بار سوچا۔ پھر کتاب بند کر کے بولی۔

"تمہاری بچی کو تو چوہدری احمد خاں سے کر آئے تھے۔"

"جی ہاں!——"

تو پھر ان کے پاس جا کر ڈاکٹر صاحب کے نام ایک خط لکھوا لو اور

کر ڈاکٹر صاحب کے بنگلے چلے جاؤ—— وہ فوراً آ جائیں گے!——

وہ بولی۔

"چوہدری احمد خاں کی لڑکی سے ان کی محبت جو چل رہی ہے——

"اوہ——" بابا نے سکون کی سانس لی۔ پھر بھی اسے پسینہ

اور وہ کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ کوٹھی میں پہنچا—— تو اس نے دیکھا کہ تمام دروازے بند

پڑے تھے وہ چوہدری احمد خاں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے ہی والا



کہ نواب ارجمند کا نام سن کر ٹھٹھک گیا۔ نہایت احتیاط سے اس نے اپنا کان دروازے پر لگا دیا۔

"اب نواب ارجمند سے انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے——"

چوہدری احمد خاں جیسے نشے میں چور ہو کر بولا۔

اب میں مزلہ کے بچے کو اپنی شطرنج کا مہرہ بنا کر اس کی ساری دولت حاصل کروں گا اور جو تصویریں ہم نے کھینچی ہیں وہ اس بات کی گواہی دیں گی کہ مزلہ ہمارے ہاں رہی تھی۔ جس دن بچہ اپنی ماں کا دودھ چھوڑے گا۔ وہی دن مزلہ کی موت کا ہو گا——"

"تو کیا آپ مزلہ کو قتل کرا دیں گے؟——" یہ آواز جمیلہ کی تھی۔

بابا ایک قدم لڑکھڑا گئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دونوں میرے اور میری بیٹی کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔

"ہاں!——" چوہدری احمد خاں کہہ رہے تھے۔

"ہم ارجمند کو اس بات کا یقین دلائیں گے یہ اسی کی اولاد ہے جس کو مرتے وقت مزلہ نے انہیں سونپ دیا تھا۔

"بچہ ہونے کے بعد جو تصویریں ہم لیں گے وہ کافی ثبوت ثابت ہوں گی مزلہ یہی سمجھے گی کہ ہم پیار و محبت سے تصویریں لے رہے ہیں۔ مزلہ کی موت کے بعد اس بچے کی ماں تم ہو گی——"

دفعتاً دوسری طرف سے کسی کے آنے کی آہٹ سن کر وہ وہیں ٹھٹھک گیا۔ پھر وہ وہاں سے جلد ہی ہٹ گیا۔ سامنے سے چوہدری احمد خان کی ناجا اولادیں آ رہی تھیں۔ بابا ایک کھمبے کی آڑ میں چھپ گیا۔ اُن کے قدم لڑکھڑا تھے۔ منہ سے دیسی شراب کی بو آ رہی تھی۔

ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

"مزلہ! جلدی سے فارغ ہو جائے تو سب سے پہلے میں اُسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ کمبخت کی آنکھیں کیا ہیں۔ جیسے کوئی خوبصورت جھیل ہے۔"

بابا کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ یہاں تو ایک سے ایک بڑھ کر تھا ہے۔ باپ کا منصوبہ کچھ اور ہے بیٹوں کا کچھ اور ——

اُس کا دل چاہا کہ واپس چلا جائے۔ اُس نے سوچا وقت کم ہے اس اُسے جو بھی کرنا ہے۔ فوراً ہی کرے ہو سکتا ہے کوئی نئی مصیبت آن پڑے اسی لیے وہ فوراً مزلہ کے پاس چلا گیا۔ اُس نے مزلہ کو سارا ماجرا سنا ڈا اُس کی جان ہی نکل گئی۔ گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اب اسے ان دی سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

اُس نے اپنے بابا کی طرف بہت مایوس نظروں سے دیکھا۔ بابا نے بیٹی نظروں کا مطلب بھانپتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! — اگر تو دو قدم بھی چلنے کے قابل ہوتی تو میں تمہیں بچا لیتا۔



"چلو بابا! —"، کہتے ہوئے مزلہ نے بڑی مشکل سے اپنے پیٹ کو ہاتھوں سے سنبھالا اور اٹھنے لگی۔

"اس ہسپتال میں کسی کے جال میں پھنس کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دوں —"، بابا کا ہاتھ اُس نے پکڑ کر بچی کو سہارا دیا۔ اور قدم آگے بڑھا دیا۔ انہیں باہر آنے کے لیے تو معمولی سی احتیاط ہی کافی تھی۔

اُنہیں کسی نے بھی نہیں دیکھا کیونکہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ مزلہ کانپنے لگی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ہسپتال کا لان بھی اچھی حالت میں نہیں تھا۔ بارش ہوتے ہی کیچڑ سے بھر گیا۔ وہ بڑی مشکل سے کیچڑ سے لت پت ہو کر ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکلے۔

باہر اندھیری رات کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا تب ہی اچانک بجلی کوندی تو بابا نے دیکھا۔ کہ ہسپتال کی دیوار سے لگا ایک گدھا سر جھکائے کھڑا ہے۔ بابا کی آنکھیں ایک خیال سے چمک اُٹھیں۔ وہ مزلہ کو وہیں چھوڑ کر گدھے کو پکڑ لایا اور بڑی مشکل سے اُسے گدھے کی پشت پر بٹھا دیا۔

مزلہ اپنی بے کسی پر زار زار رو پڑی اُس نے نواب ارجمند کو دل ہی دل

بیں کوسا۔ کمبخت کی حویلی گر پڑے اور وہ بھی میری طرح در در کا بھکاری ہو
خدا اُسے کبھی معاف نہ کرے اسی کی وجہ سے میں آج اس حالت کو پہنچی ہو
تقریباً دو گھنٹے متواتر وہ ایک انجان راستے پر سفر کرتے رہے۔ کبھی کبھی بجلی
چمک نے اُن کی راہنمائی کی۔

ورنہ اندھیرے کی چادر کے سوا کچھ بھی نظر نہ آرہا تھا۔ کوئی جھونپڑی یا لا
نہیں آیا۔ لیکن اچانک پھر بجلی چمکی۔ تو بابا کو کچھ دور ایک برگد کا دیو ہیکل
نظر آگیا۔ انہوں نے گدھے کو اُسی طرف ہانکنا شروع کر دیا۔ لیکن گدھا
کی وجہ سے اکڑ چکا تھا۔ وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔

اُس کے گرنے سے مزلہ بھی نیچے کیچڑ میں گر کر لت پت ہو گئی۔ بابا نے
سے اپنے ناتواں ہاتھوں سے مزلہ کو اٹھایا اور اسے لے کر درخت کے
آگیا۔ کچھ دیر انہوں نے بارش کے رکنے کا انتظار کیا۔ جب بارش تھم گئی
پھر انجانے سفر پر روانہ ہو گئے۔

جلد ہی اُنہیں ویرانے میں ایک کوٹھی نظر آگئی۔ بابا نے خدا کا شکر
اور مزلہ کو کوٹھی میں لے آیا — مزلہ کو سخت درد تھا۔ آخر یہ کس
سزا انہیں دی جا رہی ہے کس گناہ کی بابا نے اپنی بچی کو سینے سے
مزلہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے
اس کی روح نچوڑ رہا ہے۔ اور جب یہ درد ناقابلِ برداشت حد تک



تو وہ اپنے سر کے بال نوچنے لگی۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ لیکن اس کے باوجود درد بڑھتا ہی گیا۔ مزلہ نے بے قابو ہو کر اپنے بابا کے ہاتھوں پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ درد جوں جوں بڑھتا گیا۔ وہ بابا کی ہتھیلی کو کاٹتی چلی گئی۔

تب ہی ایک ننھے سے بچے کی پیدائش ہوئی۔ مزلہ کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بابا نے دیکھا کہ کوٹھی میں کیچڑ سے لت پت ایک انسان کی اولاد نے جنم لیا تھا۔ اور وہ خدا کی اس قدرت پر حیران رہ گیا۔ معاً کوٹھی کے باہر سے کئی لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ پھر قدموں کی تیز چاپ کے ساتھ ایک شخص ہاتھ میں ٹارچ لیے اُن کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور بڑے دبدبے سے بولا۔

"کون ہو تم لوگ؟ —"

بابا کانپتے ہوئے گڑگڑایا۔

"یہ میری بچی ہے۔ نووارد نے پہلی مرتبہ ٹارچ کی روشنی مزلہ کے چہرے پر ڈالی تو وہ وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور بولا۔

"اچھا تم لوگ یہیں ٹھہرو! میں ہسپتال سے گاڑی لے کر آتا ہوں"

"ہسپتال!! —" بابا نے بڑی اور حیرت کے ساتھ اس شخص کو دیکھا۔

"ہاں —" یہاں نزدیک ہی ایک ہسپتال ہے۔ وہاں کوئی بیسیہ

نہیں لگتا۔ اور وہاں تمہاری بچی کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے گی"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

جب صبح کی کرن شعاعیں نئی زندگی کی روشنی کے ساتھ ہسپتال کی کھڑکیوں سے اندر داخل ہوئیں تو مزلہ سو رہی تھی۔ لیکن جلد ہی روشنی دیکھ بیدار ہو گئی۔ اس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا وہ وارڈ صاف ستھرا تھا شاید ہسپتال نیا نیا ہی بنا تھا۔ مزلہ نے تشویش سے اپنے بچے کی کی طرف دیکھا۔ جو قریب ہی ایک پھول کی مانند آنکھیں بند کئے سو رہا نرسیں وارڈ میں بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ اچانک وارڈ میں ڈاکٹر عورت داخل ہوئی۔ وہ سیدھی مزلہ کے بیڈ کی طرف چلی گئی۔

"اب آپ کیسی ہیں؟ ——"

مزلہ نے پر امید نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ بولی۔

"اب میں اپنی طبیعت بالکل ٹھیک محسوس کر رہی ہوں ——" ڈاکٹر نے اسے سرسری طور پر چیک کیا۔ اور وہاں سے ہوتی ہوئی دوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گئی۔ مزلہ پھر دوبارہ آنکھیں بند کر کے خیالات میں گم ہو گئی۔ خیالات جو اس کے حواس پر چھائے جا رہے تھے۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک جو واقعات گذرے ہوں وہ حقیقت نہیں صرف خواب ہوں لیکن جب وہ آنکھیں کھول کر اپنے بچے کی طرف دیکھتی



اُسے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو جاتا۔ ادھر جیسے جیسے دن گذرتے جا رہے تھے ان کے دل میں ایک خوف گھر کرتا جا رہا تھا کہیں چوہدری احمد خاں کے آدمی مزلہ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں نہ پہنچ جائیں۔ اس لیے وہ ہسپتال میں رہتے ہوئے بھی خود کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اگر کسی بھی انجانے شخص پر مزلہ کو شک ہو جاتا تو وہ فوراً ہی اپنے آپ کو سر تک کمبل سے ڈھانپ لیتی۔ چوتھے دن کی شام تھی پلنگ پر پڑے ہوئے مزلہ اکتا گئی تو کمرے کی کھڑکی پر چلی آئی۔

اس کا ننھا بچہ دودھ پی کر سو چکا تھا وہ وہاں کھڑے ہو کر ایک حویلی کی طرف دیکھنے لگی۔ جو ہسپتال کے دوسری طرف تھی۔ کوٹھی بڑی شاندار معلوم ہوتی تھی۔ وہ متجسس نظروں سے کوٹھی کی سمت جھانک رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی آیا۔ حویلی کے ایک کمرے میں پلنگ کی چادر تبدیل کر رہی تھی۔ اس حویلی کو دیکھ کر اُسے نواب ارجمند کی حویلی یاد آ گئی۔ جہاں سے اس کی مصیبتوں کا آغاز ہوا تھا۔ مزلہ واپس اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔

اس سے یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ دوبارہ اس حویلی کی طرف دیکھے کیونکہ اُسے دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ وہ ہسپتال میں تقریباً ایک ماہ رہی اب اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔ بابا اور مزلہ نے ڈاکٹر اور ہسپتال کے دوسرے عملے کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اپنی نئی منزل کی طرف گامزن ہو گئے

نواب ارجمند خان اپنی حویلی میں بیٹھے ہوئے ایک درخت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جو اُن کی حویلی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ جس کی جڑوں کو بے گناہوں کے لہو سے سینچا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کے بعد اس درخت پر بھی حالات اثر پذیر ہوئے تھے۔ کیونکہ پتیوں پر پہلے جیسی تازگی نہ تھی۔ شاخیں بازو پھیلائے ہوئے جھوم نہیں رہی تھیں۔ نواب ارجمند نہ جانے کتنی دیر اس درخت کو گھور کر اپنی پرانی یادیں تازہ کرتے رہے کہ اچانک جمیل لان میں داخل ہوا۔ چہرے پر مسرت اور بے چینی کی علامتیں لیے ہوئے۔

"نواب صاحب! ہم آپ کے لیے ایک بے پناہ مسرت کی خبر لے کر آئے ہیں۔"

"کیا؟ —" نواب ارجمند نے چونک کر دریافت کیا۔

"کیا مزلہ کا پتہ چل گیا؟ —"

جمیل کو پتہ تھا کہ اگر نواب کے لیے کوئی خوشی کی خبر ہو سکتی ہے۔ تو وہ صرف مزلہ ہی کے متعلق ہو سکتی ہے۔

"جی ہاں نواب صاحب! — سبحان پور میں آپ کی حویلی کے قریب جو ہسپتال ہے۔ مزلہ بیگم آج کل اسی میں ہیں۔ آپ کے حکم کے مطابق جب میں اس حویلی کا معائنہ کرنے کی غرض سے گیا تو بالائی کھڑکی میں



سے دیکھتے ہوئے اچانک میری نظر ہسپتال کے وارڈ میں اُن پر جا پڑی۔" جمیل نے بڑے جوش سے کہا۔

"جمیل!! —"

نواب ارجمند نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو تھام لیا۔

یہ اچانک خوشی ان سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔ اُنہوں نے کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ —" وہ بولے —

"اوہ! — آج کتنا خوبصورت دن ہے۔ کس قدر خوشی کا دن۔ کہیں اس خوشی سے میرا دم ہی نہ نکل جائے —"

"خدا نہ کرے، ہم پر آپ کا سایہ ہمیشہ قائم رہے۔ نواب صاحب۔" جمیل نے کہا۔

"لیکن ........"

"لیکن کیا؟ —" نواب ارجمند کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جمیل نے ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم نے انہیں اپنی صورت دکھانا مناسب نہ سمجھا۔" نواب ارجمند ایک لمحے کے لیے خاموش رہے۔ پھر مسکرا کر بولے۔

"یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا جمیل اگر اس کو معلوم ہو جاتا کہ تم نے اُسے دیکھ لیا ہے تو وہ وہاں سے بھی بھاگ جاتی —" انہوں نے ایک سرد آہ بھری

"لیکن ایک نہ ایک دن میں اسے اپنی سچی محبت کا یقین دلا کر ہی رہوں گا اسے بتاؤں گا کہ میرے گناہوں کا بدلہ مجھے مل رہا ہے۔ میں تنہائی کی سزا بھگت رہا ہوں—" نواب نے کہا۔

"نواب صاحب!—" جمیل نے نواب ارجمند کی اس کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں کی ایک نرس سے ملا تھا جس کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ مزلہ بیگم ایک بچے کی ماں بن چکی ہے! میرے بچے کی ماں؟—"

"جی—نواب صاحب!—"

جمیل نے جواب دیا۔ "اس بچے کو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بالکل آپ پر گیا ہے۔ یہی آنکھیں۔ یہی ستواں ناک اور سر پر ابھی



ہی سے بہت گھنے بال ہیں۔"

نواب ارجمند یہ سن کر تڑپ کر رہ گئے۔ اُن کا دل چاہا کہ فوراً دوڑ کر جائیں اور مزلہ کو سینے سے لگالیں اور اپنی اولاد کو جی بھر کر پیار کریں۔ آنکھیں اسے دیکھنے کو ترس گئیں۔

"نواب صاحب!—"

جمیل نے پھر مخاطب کیا۔ "وہ نرس بتا رہی تھی بچے کی پیدائش پر مزلہ کی جان پر بن آئی تھی۔ ہسپتال میں اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا ہے کہ کسی ظالم نواب سے خائف ہو کر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی جان چھپائے پھر رہی تھی۔ اس سلسلے میں انہیں ایک رات گدھے کی سواری بھی کرنا پڑی۔ اُس وقت وہ دردِ زہ میں مبتلا تھی اُس نے بارش و طوفان سے بچنے کے لیے اُس رات ایک کوٹی میں پناہ لی تھی وہیں کوٹی کے فرش پر ہی ننھے سے کنول کی پیدائش بھی ہوئی تھی—"

"شاید کنول کا پھول بھی کسی ایسے ہی گناہ کا پھل ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی—" نواب ارجمند نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔

"یہ تو خیر ہوئی کہ بچے کی پیدائش ہوتے ہی خبر مشن ہسپتال پہنچ گئی تھی اور جوزف نے فوراً ہی اپنی حکمت عملی سے ان کی جان بچائی ورنہ جانے کیا ہو جاتا؟—"

نواب ارجمند چند ساعت بعد خیالوں کے بھنور سے نکل کر بولے ــــ "جمیل جس جگہ کیچڑ میں ہماری مزلہ نے ایک کنول کو جنم دیا ہے اس جگہ کی زمین کو خرید کر ایک یتیم خانہ بنوا دو ــــ"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ پھر جمیل سے مخاطب ہوئے۔

"اس حویلی کو بھی ہسپتال کے حوالے کر دو ! اس طرح وہ ہسپتال اور وسیع ہو جائے گا۔"

جمیل نے خوش ہو کر کہا ــــ

"یہ تو بہت ہی نیک کام ہے نواب صاحب اس سے ہزاروں انسانوں کو نئی زندگی حاصل ہو گی اور ساتھ ہی خدا آپ کے دل کی آواز بھی جلد سن لے گا۔"

نواب ارجمند خاموش رہے لیکن چہرے کے مد و جزر سے ایسا گمان ہو رہا تھا جیسے دل کے دامن میں امید کی ایک اور کرن کا اضافہ ہو گیا ہو۔ وہ چپ چاپ اسی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور مزلہ کے متعلق سوچنے لگے۔

فادر جوزف ابھی ناشتہ کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ نوکر ایک ملاقاتی کا کارڈ دے کر آیا۔ لکھا تھا نواب ارجمند ! ــــ کارڈ کی تحریر پڑھتے ہی فادر جوزف کی آنکھوں کے سامنے مزلہ اور اس کے بابا کی کہانی گھوم گئی۔ اس لیے انہوں نے نوکر سے کہا انہیں ملاقاتی کمرے میں بٹھائے



اور خود لباس تبدیل کرنے چلے گئے جب وہ ملاقاتی کمرے میں پہنچے تو نواب ارجمند اپنے سیکریٹری کے ساتھ بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے جوزف کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہو گئے۔

"گڈ مارننگ" تقریباً دونوں ہی نے ایک ساتھ کہا۔

"گڈ مارننگ گڈ مارننگ" فادر جوزف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھئے" اور جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو انہوں نے کہا۔

"آپ لوگوں کی میں کیا خدمت کر سکتا ہوں ــــ"

"فادر ! ــــ" نواب ارجمند نے متانت سے کہا۔ "ہم آپ کے پاس ایک خاص کام سے آئے ہیں ! ــــ"

"ظاہر ہے نواب ارجمند یہاں آنے کی تکلیف کرنے والا یقیناً کسی کام سے ہی آیا ہو گا۔ کہئے ہم آپ کی کیا خدمت کرنے کے لائق ہیں"

"فادر آپ کے یہاں توبہ، یعنی کنفیشن کو تو بہت مقدم سمجھا جاتا ہے نا" نواب ارجمند نے تمہید باندھی۔

"جی ہاں۔ لیکن یہ کنفیشن اسی وقت تک معنی رکھتا ہے۔ جب تک آپ توبہ کرنے کے بعد گناہ سے اپنا دامن پاک رکھیں کنفیشن یا توبہ سے درحقیقت معافی مل جاتی ہے۔ لیکن ایسی توبہ سے نہیں کہ صبح کی شام کو پھر اسی پاپ میں الجھ گئے۔ ایسی توبہ کر کے پاپ کرنے والا اور بھی سزا کا حقدار ہے۔"

"ڈھینک یو فادر۔" نواب ارجمند کے دل کو ایک خوش آہنگ سکون کا احساس ہوا۔ فادر نے انہیں غور سے دیکھا۔

"فادر۔" نواب ارجمند نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں نے بھی اپنے گناہوں سے ایسی ہی توبہ کی ہے بلکہ اب اس کا بدلہ بھی دے رہا ہوں جس کا جتنا بگاڑا ہے اس کو اس سے زیادہ دے رہا ہوں۔ اور بھی زیادہ دینا چاہتا ہوں تاکہ ... تاکہ کم از کم ایک بار ہی مجھے معافی دے دے۔"

فادر جوزف نے نواب ارجمند کو بغور دیکھا۔

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔"

"میں مزلہ کی بات کر رہا ہوں ا۔۔۔"

"مزلہ ا۔۔۔"

"جی ہاں۔ وہی مزلہ جو اس وقت آپ کے ہسپتال میں ہے اور جس کی جان بچا کر آپ نے اس پر ہی نہیں بلکہ مجھ پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"لیکن ......" فادر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔

"نواب صاحب!" انہوں نے کہا۔ "وہ مزلہ نے جن باتوں اور حالات کا انکشاف کیا تھا۔ ان کے تحت میں نے اسے یہاں سے چلے جانے دیا۔"

"کیا مزلہ چلی گئی ۔۔۔"



نواب ارجمند کے دل پر جیسے گھونسہ لگا۔

"ہاں ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس درجہ بدل چکے ہیں۔ اس نے اپنی روداد سناتے ہوئے آپ کے خلاف اس قدر نفرت کا اظہار کیا تھا کہ میں خود بھی ......" فادر جوزف کہتے کہتے رک گئے۔

"فادر! اس نے جو کچھ بھی کہا ہے درست ہے۔" نواب ارجمند نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"وہ اس کا یقین نہیں کرنا چاہتی کہ میں بدل چکا ہوں۔ یقین کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ مجھ پاپی نے اس کے ساتھ کیا برا نہیں کیا۔" ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔" فادر کا دل ان کے لیے ہمدردی سے بھر گیا۔

انہوں نے کہا۔

"مزلہ لاہور میں ہے۔ فادر فرانسس کے پاس۔ میں اس سے خود ملوں گا اور اسے سمجھاؤں گا اپنے گناہ گار کو معاف کر دینے سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کوئی نیکی نہیں۔"

فادر جوزف نے اپنی نگاہیں ایک طرف دیوار پر آویزاں ایک بڑی تصویر پر مرکوز کر دیں، جس میں خداوند یسوع مسیح رومی سپاہیوں کی موجودگی

میں صلیب پر لٹکے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔ ان کے آخری الفاظ میں سے ایک
فقرہ اس تصویر کے نیچے تحریر تھا۔

"اے باپ انہیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ انہوں نے کیا کیا ہے"
یہ الفاظ انہوں نے ان رومی سپاہیوں کے حق میں ہی کہے تھے۔ جنہوں نے
انہیں ستانے کے بعد صلیب پر لٹکا دیا تھا۔

نواب ارجمند نے نگاہیں گھما کر اس تحریر کو پڑھا پھر کچھ سوچ کر بولے
"آپ ہمیں اس کا پتہ دے دیجئے۔ ہم خود اس پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش
کریں گے۔ میں اسے نہیں اس کا دل اس کی روح جیتنا چاہتا ہوں۔ میں
چاہتا ہوں۔ وہ مجھے کسی کی سفارش پر معافی نہ دے کسی کے دباؤ میں آکر
نہ کرے وہ از خود ہی مجھ سے محبت کرے۔ اسے مجھ سے اس قدر نفرت ہو
چکی ہے کہ اس نفرت کو پیار میں بدلنے کے لیے اب مجھے خود ہی کوئی ایسا
کام کرنا پڑے گا جس سے وہ متاثر ہو سکے!"

فادر جوزف
نے اپنے نوکر کو کچھ اشارہ کیا اور نواب ارجمند سے مخاطب ہوئے۔

"آپ کا کہنا درست ہے۔ انسان جب کسی کو دل سے محبت کرتا ہے
تو یہی آرزو کرتا ہے کہ اس کا سب کچھ اپنے لیے محفوظ کرے۔ اگر آپ ان
کو سچی محبت کے تحت اپنانا چاہتے ہیں۔ تو اس کے لیے سخت ریاضت



ضرورت ہے ساتھ ہی آپ کو بہت صبر سے کام لینا پڑے گا۔"

"میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں فادر!" نواب نے
بہت جذباتی ہو کر کہا۔

"اس کی خاطر میں اپنا سب کچھ لٹا دوں گا۔ صرف وہ مجھے معاف کر دے
دل کی گہرائی سے میں اس کے تصورات کا مرکز بن جاؤں دل و دماغ پر چھا
جاؤں۔ وہ مجھے دیوانہ وار پیار کرنے لگے۔"

"اس کے کئی راستے ہیں!" خاور نے کچھ سوچ کر کہا۔

نواب ارجمند نے پر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔ جمیل پورے وقت
خاموش ہی رہا۔ لیکن اس کی آنکھیں اور کان دونوں ہی حرکت میں تھے۔ کافی
آگئی تھی۔ نوکر نے سب کو کافی دی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" فادر جوزف نے ایک چسکی لی اور کہا۔ مزلہ
کا دل تسخیر کرنے کے اور بھی کئی راستے ہیں۔ میرا مطلب ہے مزلہ ایک غریب
لڑکی ہے اس کا بابا ایک خوددار ذہنیت کا شخص ہے جو بلا وجہ کسی کی مدد
قبول کرنا پسند نہیں کرتا لیکن اگر آپ چاہیں تو ان کی مشکلات کو دوسرے
طریقوں سے حل کر سکتے ہیں۔ آپ ان کے لیے وظیفہ مقرر کر سکتے ہیں۔ ان کے
نام کوئی ٹرسٹ جاری کر سکتے ہیں۔ اس طرح کہ کسی کو علم نہ ہو۔ رفتہ رفتہ
جب بات بڑھ جائے گی تو ایک دن اس راز کا خود ہی انکشاف ہو جائے

گا۔ سچائی کسی گواہ کی محتاج نہیں ——— جب آپ سے اس بات کا علم ہوگا
وہ یقیناً آپ سے معافی مانگے گی۔ اور اپنے آنسوؤں سے آپ کے پاؤں
پاؤں دھونا اپنی خوش نصیبی سمجھے گی۔"

"اف! ——— بس بس فادر بس مجھے مزلہ سے ایسی ہی
کی تمنا ہے۔" نواب ارجمند تڑپ اٹھے۔ جمیل کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
فادر جوزف کی صلاح کو اس نے دل سے سراہا اب تو کوئی وجہ نہیں کہ
نواب ارجمند مزلہ کا دل نہ جیت سکیں اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے
وہ زیر لب مسکرایا۔

سردی کافی بڑھ چکی تھی۔ کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد نواب ا
تے ایک کاغذ کا رول فادر جوزف کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟ ———" انہوں نے اسے لیتے ہوئے پُراشتیاق
لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے ہسپتال کے لیے ہمارا یہ ایک ادنیٰ سا نذرانہ ہے۔"
نواب ارجمند نے کہا۔

"نذرانہ"

"جی ہاں۔ آپ کے ہسپتال کے پیچھے جو ہماری حویلی ہے اسے
آپ کے سپرد کر رہے ہیں تاکہ ہسپتال کی کشادگی میں اسے بھی شا



لیا جائے ———"

"اوہ! فادر نے ان سے مصافحہ کر کے شکریہ ادا کیا اور بولے ——— "ہسپتال
کو ایک نئی بنائی عمارت مل گئی۔ اور ہمیں کیا چاہیئے۔ یوں بھی ہم جلد ہی ہسپتال
کو بڑھانے کا منصوبہ بنا چکے تھے ———"

"تب تو بہت موقعے سے ہم نے اسے آپ کے حوالے کر دیا ہے۔" نواب
نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بے شک! ———"

"فادر!" نواب ارجمند نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں آپ کا
بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں! ———"

فادر کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ نواب بھی مسکرا دیئے لیکن
پھر سنجیدہ بھی ہو گئے۔

صبح کا وقت تھا مزلہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ چھوٹا
سا گھر۔ ایک بڑا سا کمرہ ایک چھوٹا سا ——— یہ گھر اسے فادر فرانسس نے دیا
تھا۔ کیونکہ اس کے بابا کو اسکول میں ایک نوکری مل گئی تھی۔ اس گھر میں رہتے
ہوئے انہیں تقریباً ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔

اچانک کسی نے آنگن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مزلہ نے جھاڑو ایک طرف
رکھا۔ پلنگ پر سوئے ہوئے بچے پر ایک نگاہ ڈالی اور آنچل درست

کرتی ہوئی تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھولا یا۔ سامنے ایک طویل قامت کا آدمی کھڑا تھا۔

جس کے سر کے بال بھورے کم اور سنہری زیادہ تھے۔ قلمیں چوڑی اور کان سے نیچے تک دراز تھیں۔ پتلی بھوری مونچھیں مختصر سی بھوری فرنچ کٹ ڈاڑھی۔ آنکھوں پر موٹا اور قیمتی سیاہ چشمہ تھا۔ سر پر ایوننگ کیپ، جسے اس نے آنکھوں کے اوپر تک جھکا رکھا تھا۔ سرج کے سفید سوٹ میں وہ کسی اسٹیٹ کا راجکمار معلوم ہوتا تھا۔

مزلہ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر گھبرائی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ سر کا آنچل اس نے اوپر بڑھا لیا۔ اس شخص نے مزلہ کو دیکھا۔ سر سے پیر تک۔ بہت غور سے — بہت گہری نظروں سے۔ ایک معمولی سوتی ساڑھی، لیکن بہت صاف۔ بالکل اس کی خوبصورتی کی طرح۔ اس کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ لیکن آنکھوں میں سیاہ کی رات کی سیاہی ہونے کے باوجود ایک گوشے سے صبح کے تارے کی طرح ایک مقناطیسی کشش اب بھی پھوٹ رہی تھی۔ نووارد کے شگفتہ چہرے پر غم کی تاریکی چھا گئی۔

"آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟ —" مزلہ نے اسے کھویا ہوا دیکھ کر تعجب سے پوچھا — مزلہ کی سنجیدہ آواز میں بھی ایسی مٹھاس تھی جیسے نووارد کے کانوں میں سکون بھرا رس گھولا جا رہا ہو



مٹھاس تھی اُس کی آواز میں۔ یہ مٹھاس — یہ مٹھاس کاش اس کی اپنی مٹھاس ہوتی جس پر اس کا حق ہوتا۔ مزلہ کے یاقوتی پیارے پیارے ہونٹوں سے شہد میں ڈوبی گلاب کی پنکھڑیاں جھڑ رہی تھیں۔

"میں بابا کریم سے ملنا چاہتا ہوں —" نووارد نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لیے مزلہ اس کی آواز سن کر لرز گئی۔ دل میں ایک عجیب و غریب دھڑکن تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس نے یہ آواز سنی ہے لیکن کہاں کب؟ یہ اُسے یاد نہ آیا۔ نووارد اس کے کھوئے پن سے فکر مند ہوا۔ اس کے خیالات کا سحر توڑتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میرا نام سلمان ہے۔ مجھے فادر جوزف نے بھیجا ہے۔ انہوں نے مجھے رائے دی ہے کہ اگر میں بابا کریم سے تصویریں خرید لوں تو زیادہ بہتر ہو گا —"

بابا فارغ وقت میں تصویریں بھی بنایا کرتا تھا۔ وہ بہت اچھا مصور تھا آہستہ آہستہ اس کی تصویروں کو لوگ دلچسپی کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ گاہے گاہے اُس کی تصویر بک بھی جاتی تھی۔

"اوہ! —" فادر جوزف کا نام سنتے ہی مزلہ راستہ چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی۔ فادر جوزف نے اس کی بہتری کے لیے کیا نہیں کیا؟ وہ اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں"!

"میں نے آپ کو اور بابا کریم کو وہاں دیکھا تھا۔ آپ لوگوں سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو۔۔۔" سلمان نے اپنی گفتگو سے اس کے دل کا رہا سہا شبہ بھی دور کر دیا اور اسی درمیان میں سر کی ٹوپی بھی اُتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔

"اوہ! جی ہاں، شاید!۔۔۔" مزلہ اپنے حافظے کی کوتاہی پر نادم ہوئی ممکن ہے اس سے قبل اس نے اس شخص کو وہاں دیکھا ہو۔ وہ جلدی سے بولی۔

"آیئے اندر آیئے!۔۔۔"

سلمان نے

فوراً اندر قدم بڑھا دیئے۔ مزلہ اس کے آگے آگے چل کر ایک کمرے میں آئی اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے بولی۔

"آپ بیٹھئے میں بابا کو ابھی بلا کر لاتی ہوں۔۔۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

سلمان نے کہا۔

وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک وہ مزلہ کی قربت کو حاصل کرے اُس نے کہا۔

"وہ خود ہی آجائیں گے آپ تکلیف کیوں کرتی ہیں؟"



"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ آخر بلانا تو پڑے گا ہی۔۔۔" مزلہ نے جواب میں کہا ورنہ وہ اسکول بند ہونے کے بعد شام کو پانچ بجے ہی لوٹیں گے۔۔۔"

---

سلمان نے سوچا۔ وہ کہہ دے شام کو پانچ بجے تو کیا وہ ساری زندگی اُس سے بابا کا انتظار کر سکتا ہے۔ اگر مزلہ اسی طرح اُس کی نظروں کے سامنے رہے۔ لیکن اس نے ایسا کہنا مناسب نہ سمجھا مزلہ کو باتوں میں اُلجھائے رکھنے کی غرض سے اس نے پوچھا۔

آپ کے بابا کیا اسکول میں کام کرتے ہیں؟۔۔۔"

"جی ہاں بابا۔"

"کیا کام؟۔۔۔"

"ننھے بچوں کی دیکھ بھال!۔۔۔"

"تو پھر تصویریں کس وقت بناتے ہیں؟۔۔۔"

"عموماً شام کو اسکول سے واپس آنے کے بعد!۔۔۔"



"تب تو انہیں کافی محنت کرنا پڑتی ہوگی۔۔۔"

"محنت نہیں کریں گے تو گزارہ کیسے ہوگا۔۔۔ ایک چھوٹا بچہ ہے جسے پڑھا لکھا کر میں بہت بڑا آدمی بنانا چاہتی ہوں۔۔۔"

"کیا آپ کے شوہر آپ کی کوئی مدد نہیں کرتے۔۔۔" سلمان نے اُس کا دل ٹٹولا۔۔۔

جواب میں

آنسوؤں کی بوندیں مزلہ کے رخساروں پر بہہ گئیں۔ سلمان کے سینے پر انگارے ٹوٹ گئے پہلی ہی ملاقات میں اُس نے اُس سے ساری باتیں دریافت کرنا مناسب نہ سمجھیں۔ اُس نے کہا۔

"اوہ! معاف کیجئے گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میری باتوں سے آپ کے دل کو چوٹ پہنچے گی۔۔۔"

مزلہ نے

اپنے آنسو خشک کئے اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن دل پہلے ہی ناسور رس رہا تھا۔ اس لیے ناکام رہی جاتے جاتے اس نے کہا۔

"میں ابھی آتی ہوں!۔۔۔" یہ کہتے ہوئے مزلہ باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی سلمان نے اپنی آنکھوں کا چشمہ اُتار ٹوپی اور وہ ایک جگہ رکھی اور کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک دوسرے ملحق کمرے میں

چلا گیا۔ ایک ننھا سا بچہ گورا چٹا آنکھیں بند کئے نیند میں مسکرا رہا تھا۔

وہ اپنے

جذبات پر قابو نہ پا سکا اور اس نے جھک کر اس بچے کی پیشانی کو چوم لیا اس کے رخساروں کو بوسہ دیا۔ اس کے ڈاڑھی کے بال جب بچے کی نرم و نازک کھال پر چبھنے لگے تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سلمان نے دیکھا کہ اس کی چمک میں تو اپنا پرتو ہے، اس کے روپ میں اس کا اپنا بچپنا ہے۔ بچہ مسکرایا تو سلمان نے اسے فوراً گود میں اٹھا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بچے کے رخساروں پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے بچے کو پھر چوم لیا۔

اُسے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ بچے کو لٹا کر جلدی سے پلٹا اور باہر کمرے میں آ گیا۔ چشمہ چڑھا لیا۔

بابا کریم اندر داخل ہوا اس نے ادب سے سلمان کو سلام کیا۔ مزلہ بھی اُس کی پشت پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

سلمان نے بیٹھے بیٹھے اسے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

"کیسی تصویر چاہیئے بابو صاحب ؟" بابا نے جھک کر پوچھا۔

"کیسی قسم کی ؟"

"اس وقت تمہارے پاس جتنی بھی تصویریں ہیں۔ میں لینے کو تیار ہوں کیسی بھی ہوں۔"



"بابو صاحب اس وقت تو میرے پاس صرف ایک ہی تصویر ہے وہ بھی ادھوری ہے ؟۔ آپ دو دن بعد آئیں گے تو میں اسے مکمل کر دوں گا۔"

"کیا میں اس تصویر کو دیکھ سکتا ہوں ؟" سلمان نے اٹھنے کا بہانہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ۔ ہاں کیوں نہیں ۔"

بابا بازو کے کمرے میں داخل ہوا ۔ سلمان اس کے پیچھے ہو لیا مزلہ بھی پیچھے پیچھے چلی گئی۔

سلمان نے

تصویر سے پہلے پلنگ پر نظر ڈالی۔ بچہ جاگ رہا تھا۔ مزلہ نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

"بہت پیارا بچہ ہے ۔"

سلمان نے کہا۔

"کیا نام ہے اس کا ۔"

"زاہد ۔" مزلہ نے آہستہ سے کہا۔

سلمان نے سوچا کیچڑ میں جنم لینے والے حسین پھول کا نام زاہد ہی ہونا چاہیئے تھا۔ زاہد اس نے نام دہرایا۔

بابا ایک پل خاموش کھڑا رہا پھر تصویر اٹھا کر اُس کے پاس لے آیا

اور بولا۔

"یہی تصویر ہے اگر چھوٹی ہوتی تو میں اسے آج شام ہی مکمل کر دیتا لیکن کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ اسے پرسوں تک ضرور لے جا سکتے ہیں۔"

"لیکن اس نامکمل حالت میں تو یہ اور بھی خوبصورت معلوم پڑ رہی ہے" اچانک سلمان نے کہا۔

"اس طرح؟ —"

"ہاں۔ ہاں اور کیا؟ —" سلمان نے تصویر ہاتھ میں لے لی اور اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسی کو تو ماڈرن آرٹ کہتے ہیں۔ غیر ممالک میں تو ان تصویروں کی کافی قیمت مل سکتی ہے۔"

"غیر ممالک میں —"

بابا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ مزلہ بھی متوجہ تھی۔

"ہاں ہاں اور کیا؟ —" میں اس تصویر کو اسی حالت میں خرید لوں گا کتنے پیسے دے دوں؟ —" سلمان نے پوچھا۔

"پیسے؟ —"

"پیسے نہیں روپے! میرا مطلب روپوں سے ہے —" سلمان نے بات صاف کر کے اس کی پریشانی دور کر دی۔



"دو سو روپے ٹھیک ہوں گے اس کے لیے —"

"دو سو روپے؟ —"

بابا اتنی بڑی رقم کا سن کر حیرت میں پڑ گیا۔

"اچھا تین سو روپے ہی لے لو —" سلمان نے فوراً کہا۔

"تین سو روپے"

مزلہ کو اپنے کانوں پر اعتبار ہی نہیں ہوا۔

"اچھا بابا یہ لو پانچ سو روپے —"

سلمان نے جھٹ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ اسی طرح نکالے جیسے وہ انہیں پہلے سے دینے کے لیے الگ رکھ چکا تھا۔

"اب اس کے اور پیسے مت مانگنا بس! —" اور سلمان نے پانچوں نوٹ زبردستی بابا کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

بابا پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلمان کو دیکھتا رہ گیا۔ مزلہ کو بھی اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں آرہا تھا۔ اس سے پہلے کریم نگر میں اس کے بابا نے جانے کتنی تصویریں بنائی تھیں۔ چھوٹی بڑی۔ اچھی اور کافی اچھی۔ لیکن آج تک کسی نے دس روپے سے زیادہ کبھی نہیں دیا تھا۔

وہ حیرت میں پڑ گئی۔ نوٹ بابا کے ہاتھوں میں بری طرح کانپ رہے تھے۔

سلمان نے جب دونوں کی یہ کیفیت دیکھی تو اسے اپنی جلد بازی پر گھبراہٹ سی ہوئی۔ کہیں دونوں کو اس پر کسی طرح کا شبہ ہو جائے۔ اس نے فوراً کہا۔

"اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو میں اسے دو گنے دام پر فروخت کر دوں گا ——"

"دو گنے دام پر —— یعنی . . . . . . "

بابا کی زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"ایک ہزار روپے میں !——"

"ایک ہزار روپے میں ایک تصویر !——" بابا کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"جی ہاں !" سلمان نے انہیں اپنی باتوں سے متاثر دیکھ کر بات جاری رکھی۔

"میرا دھندا ہی تصویریں خریدنا ہے۔ میں یہاں سے تصویریں خرید کر غیر ممالک میں لے جاتا ہوں اور اس طرح کبھی کبھی مجھے پانچ پانچ گنا فائدہ ہو جاتا ہے۔"

"پانچ گنا !——"

"ہاں ! اور کیا ——"

سلمان نے کہا —— "بس اب تم جلدی جلدی تصویریں بنانا شروع کرو اور میں ہفتے میں ایک دن آ کر ساری کی ساری تصویریں لے جایا کروں گا ——"

بابا تب بھی کچھ نہیں بولا۔ حیرت زدہ سامنے تکتا رہا۔

مزلہ بھی بچے کو گود میں لئے متحیر سی کھڑی رہی۔

"آج سے میں آپ کا گاہک ہوں ——"

سلمان نے دوسری جیب سے ایک نوٹ اور نکالتے ہوئے کہا۔

"اس لیے میری جانب سے اس بچے کے لیے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کیجئے مزلہ بی بی !——"

"مزلہ بی بی ؟——" مزلہ چونکی

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میرا نام مزلہ ہے ؟——"

اُس نے برجستہ کہا۔

سلمان اپنی غلطی پر چونکا۔ لیکن فوراً بولا۔

"کیوں ؟ کیا فادر جوزف نے آپ کا نام مجھے غلط بتایا تھا۔ کہ بابا کریم کے پاس ایک لڑکی ہے جس کا نام مزلہ ہے ؟——"

مزلہ مطمئن ہو گئی اُس نے بچے کو دیکھا اس کے ہاتھ میں لہراتے نوٹ کو دیکھ کر وہ لینے سے انکار نہ کر سکی۔

محبت سے دیا ہوا کانٹوں کا نذرانہ بھی پھولوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور خوشبودار بن جاتا ہے۔ سلمان نے آگے بڑھ کر بچے کے گال کو پیار سے چھوا۔ ایسا کرنے میں مزلہ کے بدن سے پھوٹتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو اس کے دل و دماغ میں اتر گئی۔

اس سے قبل کہ اُس کے دل کو کوئی لغزش ہو اور مزلہ کی قربت اس کا راز فاش کر دے اس نے خود کو سنبھالا کہیں ایسا نہ ہو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے اور اس کے جینے کا ایک رہا سہا سہارا بھی اُس سے چھن جائے وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

اس نے دوسرے کمرے سے اپنی ٹوپی اٹھائی اور آنگن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

مزلہ اور بابا بدستور حیرت زدہ کھڑے رہ گئے۔

کچی سڑک عبور کرنے کے بعد وہ کافی آگے پہنچا۔ جہاں ایک لمبی خوبصورت کار اس کی منتظر تھی۔ کار کی نمبر پلیٹ پر لکھا تھا کریم نگر —— وہ نواب ارجمند تھے اُنھوں نے آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو پونچھے اور کار میں بیٹھ گئے یہ آنسو ان کی آنکھوں میں خوشی کی ایک کرن پا کر چھلک آئے تھے۔

ایک ہفتہ
گذر گیا۔



گذشتہ تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی کئی دن بعد آج دھوپ نکلی تھی۔ سردی کے موسم کی ابتدا تھی۔ اس لیے صبح کی دھوپ اچھی محسوس ہو رہی تھی ——

سلمان سے صبر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک ہفتے بعد وہ پھر مزلہ کے دروازے پر جا پہنچا۔ اس نے اپنے سر کی ٹوپی درست کی اور کنڈی کھٹکھٹائی دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے ہوئے اس نے سامنے کی کچی سڑک پر نظریں پھیلا دیں۔

"کون ہے؟ ——"

بند دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔ آواز مزلہ کی تھی جسے سن کر سلمان کی بے چین دھڑکنوں کو کچھ سکون ہوا ——

"میں ہوں سلمان تصویروں کا خریدار ! ——"

اس نے اپنے سر کی ٹوپی کو دوبارہ درست کرتے ہوئے جواب میں کہا۔

دروازہ کھلا تو سامنے مزلہ کھڑی تھی درد و غم کی پہلی جیسی تصویر بنی لیکن اس بار اس تصویر کے رخ پہ ایک نئی پریشانی کی جھلک نمایاں تھی، جس کو چھپانے کی وہ ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"سلام عرض ہے مزلہ بی بی ! ——" سلمان نے ادب سے کہا۔

جواب میں مزلہ نے بھی اُسے سلام کیا۔ اور بولی ——

"آیئے ! ——"

آنگن عبور کر کے جب وہ مزلہ کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچا تو اُس نے
کہ گھر کی حالت آج کچھ بدلی ہوئی سی تھی۔ اس کمرے میں ایک چارپائی کا
اضافہ ہو گیا تھا۔ لوہے کی کرسیاں تھیں گھر صاف ستھرا تھا۔
اُس نے
دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سامنے پالنا نظر آ رہا تھا شاید ا
میں بچہ سو رہا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اسے گو
اٹھا کر چوم لے لیکن اس بار وہ عہد کر کے آیا تھا کہ جلد بازی سے کام نہ
لے گا۔

مزلہ نے کپڑے سے ایک کرسی صاف کر کے اس کی طرف بڑھا دی،
گیا اور اپنی ٹوپی اتار کر قریب کی ایک کرسی پر رکھ دی۔

"کیسی ہیں آپ!——" اُس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کی مہربانی ہے——" مزلہ نے جواب دے کر کہا۔

"آپ بیٹھئے میں بابا کو لے کر آتی ہوں——"

سلمان نہیں چاہتا تھا کہ مزلہ اتنی جلدی اپنے بابا کو بلانے چلی جا
لیکن اس کو روکنا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ چلی گئی۔
اور نواب ارجمند
اٹھ کر بچے کے پاس آ گیا اسے چوم کر سسک پڑا۔ بہت دیر تک



وہ اسی طرح سسکتا رہا۔ پھر جب قدموں کی چاپ ملی تو بچے کو پالنے میں لٹا
کر اُس نے چشمہ آنکھوں سے اوپر اٹھایا اور اپنے آنسو جذب کئے
اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ رنگ۔ برش اور کینوس کے ٹکڑے ادھر
ادھر پڑے تھے۔ اور کچھ نہیں تھا وہاں۔ وہ پھر پہلے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔
تبھی مزلہ اندر داخل ہوئی۔ وہ تنہا تھی۔

"بابا تو کہیں باہر گئے ہیں——"

مزلہ نے اظہار افسوس کیا۔

سلمان کو جیسے دل کی مراد مل گئی۔ اس نے اپنی مسرت کو ضبط کرتے ہوئے
کہا۔

"کوئی بات نہیں میں ان کے آنے تک انتظار کر لوں گا——"

مزلہ خاموش ہو گئی۔

وہ اپنے چشمے کے اندر سے اس کی جھکی ہوئی نظروں کو دیکھتا رہا۔ وہ ننگے پیر
تھی فرش اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے پیر کے انگوٹھے سے اسے
[illegible] کر رہی تھی۔ خاموشی پھیلی رہی۔ پھر وہ خاموشی کو توڑ کر بولا۔

"[illegible] تصویر بنی!——"

[illegible]

[illegible] چونک پڑی۔ چونک کر جیسے [illegible] اپنا دل ٹٹولا

چاہا ——

"میرا مطلب ہے کوئی تصویر تیار ہوئی ابّا ——"

"بابا نے اب تک بنانا شروع ہی نہیں کی ——"

مزلہ کی جان میں جان آئی ——

"کیوں؟ ——"

"انہیں اسکول کے کام کی وجہ سے تصویر بنانے کا وقت نہیں ملا"

"تصویر بنانے کا اگر وقت نہیں ملتا۔ تو انہیں چاہیئے کہ اسکول چھوڑ دیں ——"

سلمان نے اپنے مطلب کی بات کہی۔

میرے ہاتھوں تصویریں بیچ کر تو آپ لوگوں کا گذارہ بہت اچھی طرح ہے ——"

"بابا ایسا کبھی نہیں کر سکتے ابّا ——"

مزلہ نے فوراً کہا۔

"اور نہ ہی ہم انہیں ایسا کرنے کی رائے دیں گے ابّا ——"

"مگر کیوں؟ ——"

"اس لیے فادر کے دل کو ٹھیس پہنچے گی وہ سوچیں گے کہ انھوں اتنا احسان کیا کہ نوکری کے لیے ایک جگہ نکلوائی اور اب ہم لوگ ا



نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں ——"

"آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں خود ان سے کہلوا دوں کہ آپ لوگ آزاد ہیں اور جہاں چاہے جا سکتے ہیں ——"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہونا چاہیئے ——"

مزلہ نے کہا۔

"یہ ضروری نہیں کہ تصویریں بیچ کر ہی ہمارا گذارہ ہو ہمیں غریبی میں زندگی گذارنے کی عادت پڑ چکی ہے ——"

"عادت پڑ چکی ہے یا ......."

سلمان نے ڈرتے ڈرتے اُس کا دل ٹٹولا۔

"کسی ظالم نے ایسی عادت ڈال دی ہے ——"

"ایسا ہی سمجھ لیجیئے ——"

مزلہ کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی

میں اس ظالم کا نام جان سکتا ہوں؟ ——"

"ہے ایک بہت بڑا چنڈال۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس کا نام ان دیواروں کے کانوں تک بھی پہنچے ——"

"وہ چنڈال اگر آپ کے قدموں پر گر کر معافی کا خواستگار ہو تو کیا آپ اسے معاف نہیں کریں گی۔"

"زندگی کی آخری سانس تک نہیں!۔۔۔"

سلمان نے ایک گہری سانس لی۔ پھر چند ثانیے بعد پوچھا۔

"اور اگر وہ اپنی محبت کی خاطر وہ اپنا دل بھی آپ کے قدموں میں رکھ د[illegible]

تب......؟"

"اس کے دل پر میں مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔۔۔"

مزلہ نے درد انگیز لہجہ میں کہا۔

"وہ تڑپے گا اور میں خوشی [illegible] سے ناچ اٹھوں گی۔ دیوانوں کی طرح قہقہ[illegible]

گی۔ ایسا ہی دن دیکھنے کی تو میری دلی خواہش ہے۔۔۔"

سلمان (نواب ارجمند)

کے دل پر نشتر [illegible] سے کام لینے کے باوجود [illegible]

پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں [illegible]

"مزلہ بی بی [illegible] اپنے گناہوں کا اعتراف کر لینا ایک [illegible]

بڑا کفارہ ہے۔ [illegible] سے تو گناہوں کی معافی مل ہی جاتی ہے[illegible]

"آپ اس [illegible] جانتے جس نے میری بھی نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یہ بچہ!......؟"

سلمان نے کہنا چاہا۔

"اسی پاپی کی نشانی ہے۔۔۔"

"لوگ اس کے متعلق پوچھتے ہیں تو آپ کیا جواب دیتی ہیں؟۔۔۔"

"اس کا باپ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔"

مزلہ نے کہا۔

"اور آپ کو بھی یہی بتاتی لیکن آپ کا باتیں کرنے کا ڈھنگ ہی ایسا ہے کہ میں سچائی کو چھپا نہ سکی میری اس سچائی کے متعلق فادر جوزف اور فادر فرانسس کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا۔۔۔"

مزلہ نے فادر جوزف اور فادر فرانسس کے ناموں کا تلفظ اپنے انداز بیان میں کیا۔

"یہاں کے لوگوں کو کسی کی ذاتی باتوں سے کوئی سروکار بھی نہیں۔ اسی لیے تو ہم اس جگہ کو چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں گے۔۔۔"

"اور اگر آپ کا بچہ بڑا ہو کر پوچھے گا کہ......" اس نے پوچھا۔

"اس کے دماغ میں بھی یہی بھر دوں گی کہ اس کا باپ پہلے ہی مر گیا ـــ"

مزلہ نے بہت نفرت سے کہا۔

"اسی میں اس کی بھلائی ہے ـــ"

مزلہ کی آواز بھیگ چلی تھی۔ اچانک وہ چونکی اُس نے پوچھا۔

"لیکن سلمان بابو آپ مجھ سے ایسا کیوں کہہ رہے تھے کہ میں اُسے معاف

کر دوں؟ ـــ"

"کیونکہ ایسا کرنے سے دل کو حقیقی تسکین کا احساس ہوتا ہے ـــ

سلمان نے اپنی دلی کیفیت کو سنبھالا۔

"نہیں ـــ"

مزلہ نے بضد ہو کر کہا۔



"اس کے برعکس میرا دلی سکون تو اسی میں ہے کہ میں تو کیا خدا بھی اُسے کبھی معاف

نہ کرے میری بددعائیں اُسے ناگ بن کر ڈس لیں۔ میری آہیں اس کے تن

بدن میں آگ بھڑکا دیں۔ وہ کہیں کا نہ رہے ـــ"

سلمان کچھ نہ بولا۔

دل چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ پھر بھی ضبط کرتا رہا۔ دل میں ایک امید زندہ تھی آنکھوں

کی تاریک گہرائی میں ایک کرن روشن تھی۔ کہ اس نیکی کا ثمر کبھی تو اسے ملے گا کبھی

تو اس کا بے غرض پیار رنگ لائے گا۔ کبھی تو اپنی توبہ کے ذریعے وہ اپنے گناہوں

سے معافی حاصل کر سکے گا۔

کبھی تو

مزلہ کے چمن کی کلیاں اس کی روح میں کھل اٹھیں گی۔ ہاں اگر اس کی محبت حقیقی

ہے تو ایسا وقت کبھی نہ کبھی ضرور آنا چاہیئے۔ ایسی بے لوث محبت کو کامران ہونا

ہی پڑے گا ـــ

دفعتاً کسی نے آنگن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مزلہ چونک پڑی اور اپنے آنسوؤں

کو جذب کرنے کے بعد اُس نے اُس کی جانب دیکھا۔

"شاید بابا آگئے! ـــ" سلمان نے اندازہ لگایا۔

"بابا اس دروازے سے کبھی نہیں آتے میں نے انہیں منع کیا ہے ـــ"

مزلہ کچھ گھبرائی ہوئی سی بولی۔

"کیوں؟ ——"

"آپ بھی اس دروازے سے نہ آیا کیجئے ——"

مزلہ نے کہا۔

"آنگن کا دروازہ کھولنے سے مجھے خوف سا لگتا ہے۔"

"مگر کیوں؟ ——"

"وہ......وہ...... مزلہ کہتے ہوئے جھجکی۔

"اس محلے کا ایک بہت بڑا غنڈہ ہے۔ جب سے اس کی نظر مجھ پر پڑی ہے پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ ایک پل بھی چین سے سانس نہیں لینے دیتا بیوہ جان پر آوازے کستا ہے کہ ایک دن تو آنگن میں بھی کود آیا تھا تو بابا نے شور مچا دیا۔ ورنہ........"

اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پھر آئی ——

"اب وہ یہاں کیا لینے آیا ہے ——" مٹھیاں سختی سے کس کر نے پوچھا۔

"اسے معلوم ہے کہ بابا گھر میں نہیں ہیں۔ بس اسی لیے چلا آیا۔ دروازے پر جا کر کچھ پوچھوں گی تو وہ باہر ہی سے بہت کچھ کہتا رہے کھول دوں تو غضب ہی ہو جائے۔"

"کیا نام ہے اس غنڈے کا؟ ——" سلمان نے پوچھا۔



"بشیرا ——"

مزلہ نے جواب دیا۔

"بہت بڑے گھر کا بگڑا ہوا لڑکا ہے ہمارے اصرار پر بابا نے دو بار اس کی رپورٹ پولیس میں کی مگر اس بدمعاش کا کچھ بگڑا ہی نہیں سنا ہے اس کے رشتے دار وغیرہ بڑے بڑے آدمی ہیں اسی لیے پولیس والے بھی اس سے ڈرتے ہیں"

دفعتاً پھر

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اس بار کچھ اور بھی زور سے۔

"آپ دروازہ کھولیے ——"

اپنی جیب سے نوٹ بک نکال کر اس پر بشیرا لکھتے ہوئے سلمان نے لاپرواہی سے کہا۔

"لیکن........"

"آپ دروازہ کھولیے میں یہاں ہوں ——"

سلمان نے نوٹ بک جیب میں رکھی اور کھڑا ہو گیا۔

مزلہ آنگن میں پہنچی سلمان اس کی پشت کے پیچھے چلا۔ مزلہ نے ایک بار پلٹ کر سلمان کو دیکھا پھر کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

سامنے بشیرا کھڑا تھا۔ اپنے چوڑے منہ کو بل ڈاگ کی صورت پھیلائے ہوئے منہ کے دونوں دہانوں سے پان کی لال لال پیک بہہ رہی تھی۔ آنکھوں

میں اس وقت بھی شراب کی سرخی خمار بن کر لہرا رہی تھی۔

بھرا بھرا بدن کشادہ سینہ۔ طویل قد و قامت۔ وہ ایک کامیاب غنڈہ تھا۔

"کس سے باتیں کر رہی تھی تیرا یار تو باہر گیا ہوا ہے —"

اس نے جھوم کر اندر قدم رکھا تو مزلہ خائف ہو کر پیچھے ہٹ گئی اس کے آتے ہی آنگن میں شراب کی بدبو پھیل گئی اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن سلمان کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور بولا —

"یہ رنگ روٹ کون ہے؟ اور میری اجازت کے بغیر اس محلے میں ا گھر میں کیسے چلا آیا؟ —"

"شٹ اپ یو اِڈیٹ ا —"

سلمان غصے سے چیخا۔

"اینڈ گیٹ آؤٹ فرام ہیر —"

"واہ یہ تو کوئی انگریز معلوم پڑتا ہے —"

اپنے ہاتھوں کو نچا کر بشیرے نے آگے بڑھ کر پھر مزلہ کی طرف دیکھا

"کون ہے یہ تیرا خصم؟ کیا قبر میں سے اٹھ کر آ گیا ہے؟ —"

سلمان نے

اپنی زندگی میں کسی کی آج تک کوئی سخت بات برداشت نہ کی تھی



ہی اس کے محکوم اور فرمانبردار رہے تھے۔ کئی دن سے باکسنگ چھوڑی ہوئی تھی۔ تلوار بھی نہیں چلائی تھی۔ کشتی کا ریاض مقابلہ ترک ہو چکا تھا۔ گھوڑ سواری بھی چھوٹی ہوئی تھی۔

اس کے بدن کا خون ابل اٹھا معاً اس کا تلا ہوا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور بشیرے کے دیکھتے دیکھتے اس کے جبڑے پر ایسا پڑا کہ وہ چکرا کر پیچھے کی دیوار سے جا ٹکرایا ٹکراتے ہی وہ نیچے لڑھک گیا۔ آنگن کی دیوار کے کنارے کنارے کیچڑ جمع تھا اس کا چہرہ اس میں لتھڑ کر لت پت ہو گیا۔

سنبھل کر وہ اٹھا گھور کر اس نے سلمان کو دیکھا لیکن تبھی سلمان پھر آگے بڑھا بشیرے کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اس طرح سر پٹ بھاگا کہ ان دونوں کے علاوہ اگر کوئی اور اسے دیکھتا تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔

سلمان نے جیب سے رومال نکال کر اپنا ہاتھ صاف کیا کچھ اس انداز سے جیسے کسی گندے جانور سے اس کے ہاتھ مس ہو گئے ہوں پھر اس نے مزلہ کی طرف دیکھا۔ مزلہ حیرت زدہ سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی اپنے چہرے پر اس کی نظروں کی چبھن کا احساس کر کے وہ سنبھل کر جیسے خوابوں کے سنسار سے باہر نکل آئی۔

"یہ اچھا نہیں ہوا —" وہ کانپ کر بولی —" وہ بہت خطرناک شخص ہے اب وہ ہمارا جینا مشکل کر دے گا —"

"تو پھر آپ لوگ ہی یہ جگہ کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔"

سلمان نے اپنے دل کی بات کہی۔

"میں آپ لوگوں کو بہت اچھا گھر اور بہت سستے میں دے دوں گا۔"

"نہیں — نہیں ایسا نہیں ہو سکتا —"

مزلہ نے جواب دیا۔

"یہ جگہ چھوڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہاں ہمارا راز پوشیدہ ہے۔ کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔ دوسری جگہ ہو سکتا ہے لوگ ہمیں اچھی نظر سے نہ دیکھیں — میں یہاں ہی رہ لوں گی۔ اب دونوں دروازوں کو تالا لگا کر رکھوں گی۔ باہر جھانکوں گی بھی نہیں —"

"آپ اطمینان رکھئے اب —"

سلمان کے لبوں پر ایک یاس بھری مسکراہٹ اُبھری اور دم زدن میں غائب ہو گئی۔

"اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ اس محلے میں تو کیا وہ اس شہر میں بھی دکھائی نہیں پڑے گا —"

مزلہ نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

سلمان بولا۔



"آپ کی حفاظت کرنے میں مجھے ایک عجیب و غریب مسرت کا احساس ہو رہا ہے —"

مزلہ تب بھی خاموش رہی۔ وہ اُس کی باتوں پر غور کرتی رہی کتنا شریف آدمی ہے۔ کتنا خلیق۔ جیسے ایک فرشتہ ہو۔ اگر یہ یہاں نہ ہوتے تو نہ معلوم اُسے کتنی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا۔

سلمان نے آگے بڑھ کر آنگن کا دروازہ بند کیا اور کہا

"آج کے بعد اگر یہ دروازہ رات میں بھی کھلا رکھئے گا تو اندر آنے والے کو اجازت لینا پڑے گی۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب پلٹا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے خود ہی مزلہ سے مخاطب ہوا۔

"کیا ایک کپ چائے نہیں پلائیں گی؟ —"

مزلہ ندامت سے زمین میں گڑ گئی۔ چائے تو وہ اُسے خود بھی پلانا چاہتی تھی لیکن اس کے مقابلے میں اپنی حالت کا اندازہ کر کے وہ ایسا قدم اُٹھانے کی جرأت نہ کر پائی تھی۔ اس کے اس سوال کے ساتھ ہی وہ کمال سرعت کے ساتھ رسوئی میں جا پہنچی۔ سلمان نے موقع غنیمت جان کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُسے پیار سے چوما اور اسے اچھالتا لاڈ کرتا ہوا اپنے کمرے میں لے آیا۔

دروازے کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پھر پیار کیا مزلہ کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً اٹھی دوسرے کمرے سے ایک موٹا کپڑا اٹھا لائی اور سلمان کی گود میں بچے کے نیچے بچھا دیا۔ سلمان مسکرائے بغیر نہ رہ سکا

---

دن بیتنے اور مہینے گذر گئے۔ بچہ لڑھکنے لگا تھا۔ بچے کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتی ایک سال گذر گیا۔ بچہ آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا۔ بہت خوبصورت بچہ تھا۔ اس ایک سال کے دوران میں مزلہ کی مالی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔

اب بشیرا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ محلے کے لوگوں کو اس سے نجات مل گئی تھی۔ لوگوں کو پتہ چلا تھا کہ کسی نواب کی وجہ سے پولیس نے اس کی خوب پٹائی کی تھی اور کسی جرم میں پھانس کر جیل میں ٹھونس دیا تھا۔

اس ایک سال کے دوران میں سلمان مزلہ کے گھر پندرھویں دن ضرور آتا تھا۔ آتے ہی وہ بچے کو گود میں اٹھا لیتا اور اسے پیار کرتا۔ وہ اس کے

لیے کچھ چیزیں بھی لانے لگا تھا۔ وہ اس کے اسی حسن اخلاق کو دیکھ کر انکار بھی نہ کر سکتی تھی۔

ایک سال

میں کریم بابا نے کم سے کم بیس تصویریں بنائی تھیں اور کافی روپیہ کمایا تھا وہ بہت مطمئن اور خوش تھا۔

ایک دن سلمان نے اپنی ٹیکسی مزلہ کے دروازے کے سامنے سڑک پر روکی اب وہ ٹیکسی سے ہی آنے لگا تھا کہ ابتدا ہی سے اس نے اپنی ذاتی گاڑی کا استعمال بند کر دیا تھا۔ مبادا اس کی حقیقت کا اظہار ہو جائے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دیا اور کار کے پچھلے حصے سے ہاتھ بڑھا کر ایک پیکٹ اٹھا لیا ـــــ

پھر اس نے دروازہ کھلوایا۔ سامنے مزلہ کھڑی تھی۔ حسب عادت آج اسے دیکھ کر وہ مسکرائی بھی نہیں ـــــ

"کیا بات ہے مزلہ بی بی! ـــــ" اس نے پوچھا۔

"ایک ہفتہ ہوا کہ بابا ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔" مزلہ کا گلا رندھ گیا ـــــ

"مزلہ! ـــــ" سلمان چیختے چیختے رہ گیا۔ پیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"سامنے والے دوکاندار سے کچھ خریدنے گئے تھے کہ اس نے کوئی نازیبا



بات کہہ دی۔"

"کیا بات ہے ـــــ"

"یہی کہ ........ یہی کہ ........"

مزلہ کی آنکھیں چھلک آئیں حیا نے گویائی چھین لی تھی آخر بمشکل اس نے کہا "یہی کہ تمہاری تصویریں تو پچاس روپے میں بھی کوئی نہ خریدے گا پانچ سو یا ہزار روپے دے کر تصویریں خریدنے والا تمہاری بیٹی کی وجہ سے ہی ....."

مزلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ غصے سے سلمان کی مٹھیاں سخت ہو گئیں اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس نے باہر کی جانب دیکھا دوکان میں وہ بیٹھا تھا اسے دیکھتے ہی اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ سلمان بل کھا کر رہ گیا۔

"اسی بات پر بابا کو طیش آگیا ـــــ"

مزلہ نے اپنے احساس پر قابو پا کر کہا۔

"بات اتنی بڑھی کہ سارا محلہ جمع ہو گیا۔ سب ہی نے اس دوکاندار کی طرف داری کی۔ بابا اس توہین کو برداشت نہ کر سکے گھر آ کر مجھ پر ہی برس پڑے میں بے قصور تھی پھر بھی خاموش رہی اچانک بابا کے سینے میں درد اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہونٹ سختی سے بند ہو گئے۔ اور وہ مر گئے ـــــ

"یہاں کے لوگ تو ہمیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے ۔۔۔"

سلمان نے

کوئی جواب نہ دیا دل ہی دل میں محلے کے لوگوں پر جھلانے لگا۔ یہ سب اُسی کی مہربانی کا نتیجہ تھا جو اس محلے کا نقشہ بدل گیا تھا۔ یہ سڑک یہ سب دکا[نیں] اُسی کے کہنے پر کھولی گئی تھیں تاکہ مزلہ اور اس کے بابا کو ضرورت کی اشیا خریدنے کی غرض سے دور جانے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے اُس نے دل ہی دل میں یہاں کے باشندوں کو لعنت ملامت بھیجی ۔۔۔

"سلمان بابو! ۔۔۔"

اچانک مزلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"ایک عرض کروں، بُرا تو نہیں مانیں گے ۔۔۔"

"نہیں! ۔۔۔ مزلہ بی بی۔ کبھی نہیں ۔۔۔"

اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"میری بات پوری کر دیجئے گا اب ۔۔۔"

"ایک پل گنوائے بغیر آپ کی آرزو کی تکمیل کرنا میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

"آپ کو میرے زاہد کی قسم۔ مہربانی کرکے اب آپ ہمیشہ کے لیے یہاں آنا بند کر دیجئے ۔۔۔"



مزلہ نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر کر کہا۔

"مزلہ بی بی! ۔۔۔"

سلمان کو محسوس ہوا جیسے محلے والوں ہی نے اس کے سینے پر گھونسہ دے مارا ہو اس نے اس کی مخالفت کرنا چاہی۔

لیکن تبھی

مزلہ اُس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔

"جب تک بابا زندہ تھے ہم نے آپ کے یہاں آنے پر کبھی اعتراض نہ کیا۔ محلے والوں نے کئی بار مجھ پر کیچڑ بھی اچھالنا چاہا۔ لیکن کچھ کہہ کر ہم آپ کے احساس کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ اب بابا نہیں رہے اس لیے تصویریں بھی نہیں بنیں گی۔ آپ نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا۔ میرے بچے کو خوبصورت کھلونے دیئے۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں اب یہ نہیں چاہتی کہ بچہ بڑا ہو ہو کر میرے متعلق کوئی غلط اندازہ لگائے ۔۔۔"

اس نے سوچا مزلہ ٹھیک کہتی ہے۔ تصویریں نہیں بنیں گی۔ تو اس کے یہاں آنے کا مقصد ختم ہو گیا۔

معاً کمرے

کے اندر سے زاہد کے رونے کی آواز آئی۔ شاید وہ سوتے سوتے جاگ اٹھا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اندر جا کر وہ اسے گود میں اٹھائے۔ اُسے چومے

پیار کرے اس نے اپنے ہاتھ کے پیکٹ کو دیکھا۔ پھر مزلہ کو۔ مزلہ اس کے
کی کیفیت کا اندازہ لگائے بغیر ہی اندر چلی گئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا چند
بعد زاہد کے رونے کی آواز بند ہو گئی لیکن مزلہ باہر نہیں نکلی۔

اُس نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا۔ آخر مایوس ہونے کے بعد آگے بڑھ
اُس نے پیکٹ وہیں برآمدے میں رکھ دیا اور واپس پلٹ کر
نکل گیا ——

"جمیل"، ایک کرسی میں دھنسے ہوئے نواب ارجمند نے چاندی کی
کو اپنی انگلی میں گھماتے ہوئے کہا۔

"مزلہ سے ملنے کا ذریعہ اب میرے لیے ہمیشہ کے لیے ختم
وہ ارجمند کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی تقریباً ایک سال سے
بن کر اُس کی قربت حاصل کرتا رہا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے —"
جمیل کے قریب آئے۔ اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سسک پڑے
جمیل کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ اُس نے سمجھایا۔ محبت میں ریاضت
نہیں جاتی۔ جو گناہ ان سے سرزد ہوئے ہیں۔

ان سے کہیں زیادہ وہ ان کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔ ظلم کی قیمت
ادا کر چکے ہیں۔ یہ مزلہ کی زیادتی ہو گی کہ حقیقت سے آشنا ہونے
بعد بھی اُنہیں معاف نہیں کرے گی۔ اس نے کہا۔



"آپ نے اچھا کیا ہے۔ جو اس پر اپنی حقیقت کو منکشف نہیں کیا۔ مگر
بے لوث محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ خدا آپ کا امتحان لے رہا ہے۔
آپ کو مایوس ہرگز نہیں ہونا چاہیے ا —"

کافی دیر
بعد نواب ارجمند رنگ محل میں آکر بیٹھ گئے۔ اس قید خانے کے اندر
جہاں ان گنت روحوں کا خون ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام روحیں
اس کے اندر مقیم ہیں۔ قید خانے میں بے شمار تصویریں لگی تھیں۔ یوں لگتا
تھا۔ جیسے مظلوم روحیں تصویریں بن گئی ہوں — اور ان میں کسی معصوم
دوشیزہ کا سراپا جھلک رہا ہو —
وہ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں۔ لب نیم وا ہوئے سسکے —
ایک طرف اکو پریم استادہ تھا۔ بالکل خالی۔ مزلہ کے جانے کے
بعد اس میں کسی مچھلی کو قید نہیں کیا گیا تھا۔

انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مزلہ کی محبت کی خاطر وہ اپنا سب کچھ پہلے
سے بھی زیادہ لٹاتے رہیں گے مزلہ کو حاصل کر لینے کی آس تو ضرور دم توڑتی
نظر آرہی تھی لیکن یہ آس کہ مزلہ انہیں معاف کر دے گی اب پوری توانائی
کے ساتھ دل میں زندہ تھی۔

انسان تو اپنے ساتھ جنم کے پاپی کو بھی معاف کر دیتا ہے پھر مزلہ

تو عورت کے لباس میں نیکی کا فرشتہ ہے انہیں کیوں معاف نہیں کیا
گیا ؟ ——

زاہد کی عمر کے تقاضے کے ماتحت انہوں نے اسکولوں میں فنڈ
دیئے۔ جہاں جہاں اُس نے داخلہ لیا۔ اُنہوں نے ایسے ایسے تعلیمی
کی ابتداء کی جن میں ان کے لڑکے کو دلچسپی تھی۔ اور ان کے لڑکے
بچپن ہی سے کامیابی حاصل کر کے بے حساب انعامات حاصل کر
کر دیئے۔

خوب خوب نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اسکولوں کے بعد کالجوں
لیکن اس بات کا اسے وہم وگمان بھی نہ ہو سکا کہ اس کی کامیابی
کسی اور کا ہاتھ ہے مزلہ اپنے بیٹے کی ہوشیاری اور ہنر مند
کرتی۔

کالج کا سٹاف اس پر مہربان تھا پرنسپل اس کے بچے کو
تھے اور زاہد دن بدن جوان ہوتا گیا۔ ایک کے بعد ایک کامیا
کرتا گیا اور اسی بائیس سال کے عرصے میں نواب ارجمند نے مزلہ ا
کی خدمت کرتے کرتے زندگی کا بہت کچھ کھو دیا بلکہ سب کچھ، ا
گیا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔

کچھ بھی تو نہیں بچا اُن کے پاس صحت۔ دھن دولت،



بائیس سال کے اس طویل عرصے تک خدمت کرتے کرتے جمیل بھی اس دنیا
وچھوڑ کر چل بسا۔ انہیں پریشانیوں نے آگھیرا تھا۔ سب کچھ اجڑ گیا تھا
وکر چاکر سب چلے گئے تھے۔ وہ اکیلے رہ گئے تھے۔ رنگ محل بھوت محل
بن کر رہ گیا تھا۔ حویلی اجڑی اجڑی اور ویران تھی۔ ہر طرف دہشت محسوس
ہوتی تھی۔ جیسے انہیں اپنے گناہوں کی کافی سزا مل گئی ہو ——— وہ
بالکل اکیلے رہ گئے تھے ——— !

---

لاہور کا ہوائی اڈہ —

آکاش کا پنچھی تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے جیسے ہی زمین پر اترا اس کی
کوکھ سے مسافر انڈے، بچے کی طرح باہر نکلنے لگے۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک بوڑھی
عورت جنگلے کے نزدیک بھیڑ سے کچھ پرے ہٹ کر کھڑی تھی —

جسم پہ
لکادی کی ساڑھی اوپر سے شال لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے سر کے بال
کافی سفید ہو چکے تھے چہرے کا رنگ گورا تھا۔ کہیں کہیں جھریاں جھلک رہی
تھیں۔ گہری سیاہ آنکھوں سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ اس کے باوجود
لبوں پر ہلکے تبسم کی ایک لکیر نمایاں تھی۔
اس ماحول سے مشابہ جو [illegible] تحلیل ہو کر اداس ہو رہے تھے [illegible]



لیں کہیں آفتاب کی ضیاء پاش کرنوں میں جھلک اٹھتا ہے آج اس عورت
راس کی تمام زندگی کی ریاضت کا ثمرہ ملنے والا تھا۔

اس کی
انتھک محبت کا انعام کتنی تکلیفوں کا مسلسل مقابلہ کرتے ہوئے اُسے
دن دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ آج اس کا لاڈلہ آ رہا تھا۔ اس کا بیٹا
لہ ابھی ہوائی جہاز سے اُترے گا۔ تین سال بیت گئے اسے دیکھے ہوئے۔
تین سال کے بعد آرکیٹیکٹ بن کر وہ آج ہی ولایت سے اپنے ملک
رٹ رہا ہے اس کے خیر مقدم میں اس نے پھولوں کا ایک موٹا سا ہار
رد اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ فرطِ محبت سے اس کے ہاتھ ہار
ہ کانپ رہے تھے۔

دفعتاً اس کے ہاتھ ہوا میں لہرائے لبوں پر مسکراہٹ کچھ فزوں ہو گئی۔
وپ جیسے بدلی کی چادر الٹ کر پورے ماحول پر بکھر گئی۔ آنکھیں بھی
ک اٹھیں۔ لیکن اس چمک کے پردے میں بدلی کی تاریکی پوشیدہ نہ
سکی۔

اس بادل کے ٹکڑے پر جب دل نے پیار سے بوجھل ہوا کا دباؤ ڈالا
رش آنسوؤں کی شکل پھوٹ پڑی اور لمبی لمبی پلکوں پر آ کر ٹک گئی۔ اُس
ہ آنسوؤں کو جذب نہیں کیا۔

اُس نے

اپنا شال درست کیا اور سیڑھیاں پار کرکے ہوائی جہاز کی طرف سرعت
سے بڑھ گئی۔ بیٹے کے خیر مقدم کی خوشی میں اُس نے دور ہی سے ہاتھوں کو
آگے بڑھاتے ہوئے ہار کو پھیلا دیا۔ بیٹیا ماں کو دیکھ کر دیر نہ کر سکا۔
لپک کر اُس نے اُس کے قدم چھو لیے اور چھاتی سے لپٹ گیا۔ ہار
کر اس نے ماں کے گلے میں ڈال دیا۔ ماں کے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ ماتا
میں کتنی کشش ہوتی ہے کتنی زیادہ مٹھاس! مسرت میں ضبط کا یارا
نہیں رہا۔

تو بے اختیار آنکھیں چھلک آئیں۔ آنسو بھی وہ حیرت انگیز
ہیں جو انسان کو خوشی اور غم دونوں ہی برداشت کرنے کی قوت بخشتے ہیں
جب ماں کے آنسوؤں نے بیٹے کی پلکیں بھی نم کردیں تو ماں کو اپنی غلطی کا
احساس ہوا۔ ایسی خوشی کی گھڑی میں یہ رونا دھونا کیسا؟ ——

بیٹے کو
چھاتی سے لگا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نظریں شاید کسی کو تلاش
رہی تھیں۔

"کیا بات ہے ماں! ——"

بیٹے نے مسرت اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں

"کسی کو تلاش کر رہی ہو کیا؟ ——"

"تو نے تو خط میں لکھا تھا کہ تیرے ساتھ کوئی لڑکی بھی آرہی ہے ——"

"کون شاہدہ؟ ——"

زاہد نے کہا ——

"وہ آنے والی تو ضرور تھی لیکن اسے اپنے ضروری کاغذات حاصل کرنے
میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اس لیے میں زیادہ انتظار نہیں کر سکا تم سے ملنے کی
مجھے جلدی تھی نا! ——"

"میرا اچھا بیٹیا! ——"

ماں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو رکھا۔ اور پیار بھری
نظروں سے دیکھتی ہی گئی۔ پھر کھوئے کھوئے انداز سے بولی۔

"ہو بہو وہی چہرہ، ویسی ہی جوانی، لانبا قد، آنکھوں میں وہی کشش
لانبی لانبی پلکیں بالوں کا انداز، —— رنگ روپ، سب کچھ وہی ہو بہو
وہی ——"

ماں کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ تو اس نے اپنے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

"ماں! ——"

زاہد نے اس کی بانہیں تھام لیں۔

"جو انسان مر جائے اُسے بار بار یاد نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے

اُس کی روح کو اذیت ہوتی ہے ــــ"

ماں چپ

ہو گئی۔ ماں کی ممتا نے صبر کر لیا۔ لیکن اُس کے اندر کی مزلہ اگاؤں کی ایک مظلوم لڑکی اب بھی رو رہی تھی رو رو کر نواب ارجمند کو کوس رہی تھی زاہد سے اپنی حقیقت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اُس نے اسے بتایا تھا کہ اِن کے والد اُس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ پہلی بار ایسا کہتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کی زبان دانتوں تلے آکر کٹ گئی تھی۔

خون چھلک آیا اس نے نواب ارجمند کو اور بھی بُرا بھلا کہا تھا لیکن گزشتہ تین سال کے دوران میں اُس نے اپنے اندر ایک عجیب و غریب تبدیلی کا احساس کیا تھا۔ نواب ارجمند کو بُرا بھلا کہتے کہتے آنکھیں نم ہو جاتیں تھیں ان کا خیال آتے ہی اس کے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگتی۔

زاہد ولایت

میں تھا اس لیے تنہائی میں مغلوب ہو کر وہ اکثر یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ آخری ملاقات پر نواب ارجمند نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ سچ ہی ہو گا شاید . . . ہاں شاید اُسے دل کی گہرائی سے چاہنے لگے تھے۔

شاید وہ اسے اپنی بیگم بنا لیتے۔ شاید وہ زندگی بھر اس سے محبت



کرتے رہتے۔ رشتہ [illegible] کسی نے بابا کے کان بھر دیے تھے کہ وہ پہلے ہی کئی بیویاں رکھ چکے ہیں۔ اس وقت جب زاہد نے اُس کے شوہر کو مرحوم کہا تو اس کے دل میں بہت زور کا درد اٹھا۔

دل چاہا زاہد کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دے لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ کس منہ سے کہتی کہ اس کا باپ زندہ ہے؟ کیسے اُسے بتاتی کہ یہ نواب ارجمند ہی ہے جس نے اس کی ماں کو لوٹا تھا۔ اس کی جوانی کو ایک تماشہ بنا دیا تھا زاہد جوان ہے۔ اس کی رگوں میں جوانی کا گرم خون ہے۔ وہ یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکے گا اور ماں کی بے حرمتی کا انتقام لینے کے لیے فوراً ہی کمر باندھ لے گا۔ ماں کا واجب حق حاصل کرنے کے لیے زاہد کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اور پھر ایک بڑا ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ نواب ارجمند نے تو کبھی کا اپنا گھر بسا لیا ہو گا۔ ان کے بچے بھی ہوں گے اپنے خاندان کی حفاظت کے لیے ایک ہو کر زاہد کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

نواب ارجمند کو درحقیقت اس سے محبت ہوتی تو وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے اسے تلاش کر کے ایک بار پھر اس سے معافی مانگتے۔ اُسے اپنی بیگم بنانے کی خواہش کا اظہار کرتے لیکن اُنہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

اور اب

اسی لیے اس نے زاہد کی بات سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ حقیقت کو پردۂ راز میں رکھنے میں ہی اس کی بہتری تھی۔ اس کے لاڈلے کی زندگی تھی۔ اُن دونوں کی خوشی مضمر تھی۔

اپنے دل کا واہمہ دور کرنے کے لیے وہ زاہد کو کوئی خطرہ مول لینے نہیں دینا چاہتی تھی مزلہ نے زاہد کو صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے باپ کا نام ارجمند تھا اور یہ نام زاہد کے نزدیک ایک فرشتے کی طرح پیارا تھا۔

"ماں۔۔۔"

اچانک ماں کو اس طرح خیالوں کی دنیا میں کھویا ہوا دیکھ کر زاہد نے اسے ہلکے سے جھٹکا دیا۔

"تم ابھی تک ڈیڈی کے تصور میں ڈوبی ہوئی ہو؟ کیا میری موجودگی تمہارا ذرا سا بھی غم دور نہیں کر سکتی"؟

"بیٹا۔۔۔"

مزلہ نے پھر زاہد کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا پیار سے بولی۔

"تو ہی تو میرے لیے سب کچھ ہے بیٹا۔ ایسی بات تو نے کیسے سوچ لی ہے۔۔۔"



"تمہارے کھوٹے پن کو دیکھ کر"

زاہد نے کہا۔ اور پھر ہنس کر بولا۔

"اچھا تم یہیں ٹھہرو۔ یا وہاں چل کر بیٹھو۔"

اس نے قیام گاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں بس فوراً ہی کسٹم سے نپٹ کر آتا ہوں۔"

مزلہ نے بھی اپنے بیٹے کی ہنسی میں ساتھ دیا اپنی بھیگی پلکیں پونچھتی ہوئی۔ وہ قیام گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد زاہد اپنی ماں کی کمر کے گرد باہیں ڈالے باہر نکلا۔ قلی ٹیکسی پہ سامان لاد رہا تھا۔ وہ دونوں ٹیکسی کی طرف بڑھے ہی تھے۔

کہ اچانک ٹھٹھک گئے۔ مزلہ اور زاہد دونوں ہی۔۔۔ ایک بوڑھا فقیر سا آدمی نزدیک ہی کھڑا تھا کہ جانے کیوں اُسے دیکھتے ہی مزلہ کا دل بہت زور سے دھڑک اٹھا؟ جانے کیوں زاہد کے پیروں میں بھی بیڑیاں پڑ گئیں؟

بوڑھے کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب چمک تھی۔ گھنی پلکوں کے بیچ ساون کی کالی بدلیاں برس جانے کو تڑپ رہی تھیں ایک سرو قد دبلا پتلا سا آدمی۔ مونچھیں بڑھی ہوئیں۔ داڑھی لانبی سر کے بال شانے تک

جھول رہے تھے۔ سر کے بالوں پر زیادہ تر سپیدی چھائی ہوئی تھی۔ چہرہ سپید جھریوں سے بھرا ـــ درد و غم کا مزار ـــ اُس کے جسم پر معمولی کپڑے تھے۔ بہت میلی سفید قمیض اور سفید پتلون۔ پتلون گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ جیسے چھپانے کے لیے وہ اپنے ہاتھ کے ایک اخبار کا سہارا لے رہا تھا۔ اس اخبار میں زاہد کے ملک واپس آنے کی خبر چھپی تھی۔ مع تصویر کے جسے وہ کئی بار چوم چکا تھا۔

نہ جانے

کیوں ایک انجانے خوف سے مزلہ کا دل کانپ اٹھا۔ اس نے گھبرا کر زاہد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جانے کون بدمعاش ہے یہ؟ کہیں اُس کے بیٹے کے پیچھے تو نہیں پڑ گیا ہے۔ ایک ہی تو دشمن ہے اس کا ہاں ـــ وہ دشمن ہی تو ہے۔ نواب ارجمند ـــ

کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے گناہ کی اس نشانی کو مٹانے کے لیے اُس نے اس آدمی کو یہاں بھیجا ہو۔ اپنے بیٹے کی تصویر چھپوا کر اس نے واقعی بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کے خدوخال دیکھتے ہی وہ اپنے آپ کو پہچان گیا ہوگا ـــ

اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ـــ

"ذرا چل بیٹا ـــ چل ـــ"



وہ زاہد کے بازو زور سے ہلا کر بولی۔

"جانے کون بدمعاش ہے۔ جو ہمیں اس طرح گھور رہا ہے۔"

زاہد اُس سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ پھر بھی ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد چلتے چلتے اُس نے کئی بار پلٹ کر اُس آدمی کو دیکھا۔ نظریں تھیں کہ اس آدمی کی جانب کھینچی ہی چلی جاتی تھیں۔ بہت دور جانے کے بعد بھی مزلہ کا دل مسلسل دھڑکتا ہی رہا۔

اور وہ

اجنبی اسی طرح کھڑا رہ گیا۔ خاموش، مایوس ایک زمانہ گزرنے کے بعد بھی ـــ مزلہ کے اندر اُس نے اپنے حق میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ دیکھی اس کی آنکھیں امڈ آئیں۔ تو وہ آنسو جذب کئے بغیر ہی سڑک پر ہو لیا۔

کوئی منزل ہوتی تو شاید اپنے اشکوں کو خشک کر کے قدم تیز بھی کر دیتا؟ وہ تو اب ایک لاش کی طرح جی رہا تھا۔ اور مزلہ کے لیے اب اس کے پاس بچا بھی کیا ہے؟ اپنا سب کچھ قربان کر کے اُس نے اُس کے لاڈلے کو پیر پر تو کھڑا کر ہی دیا ہے۔

بس اب آخری سانسیں ہی رہ گئی ہیں۔ شاید اسی امید پر اٹکی ہیں کہ ایک دن صرف ایک بار ہی مزلہ آ کے معاف کر دے گی۔ تب اُس کا دم آسانی سے نکل جائے گا۔ اس کے پیار کا ... [illegible]

پاپ ہے۔

"ماں، ماں ——"

زاہد اپنے ساتھ ایک نئے مہمان کو لیے گھر میں داخل ہوا۔

"دیکھو تو ہمارے گھر کون آیا ہے؟ ——"

شام کا وقت تھا اور مزلہ اپنے لاڈلے کی پسند کا کھانا تیار کر رہی تھی کہ زاہد کی آواز سن کر چونک پڑی۔ باورچی خانے سے نکل کر ڈرائینگ روم میں آئی۔ زاہد کے ساتھ ایک حسین مہمان دیکھ کر وہ باغ باغ ہو اٹھی۔

حسین مہمان

ایک لڑکی!

مغربی روپ کی ملکہ جو ہر طرح سے ایک مکمل شاہکار تھی۔ زندگی کی امنگوں سے بھرپور مغربی بھی اور مشرقی بھی۔ نیلی آنکھیں کٹے ہوئے بال رنگ دھوپ سا کھلتا جینت ساڑھی میں اس کا انگ انگ نکھر آیا

نہ جانے کیوں مزلہ کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے یہ صورت اس نے کہیں دیکھی ہے۔ کہاں؟ کب وہ یاد نہ کرسکی۔

لڑکی نے جھک کر مزلہ کو آداب کہا۔ مزلہ نے اسے دل کی گہرائیوں دعائیں دیں اور فرطِ محبت سے گلے لگا لیا ... کا چہرہ ہتھیلی کے



کر اُسے غور سے دیکھا اور بولی۔

"ایسا لگتا ہے بیٹی! میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"شاید خواب میں دیکھا ہو ماں! ——"

زاہد نے جھک کر کہا۔

"اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے ایسی حسین بیوی اور اپنے لیے ایسی بہو کا خواب کون ماں نہیں دیکھتی؟ ——" لڑکی شرما گئی۔

"چل ہٹ پگلے ——"

مزلہ نے پیار سے ڈانٹ لگائی۔

"اور نہیں تو کیا ماں! جھوٹ تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں ——"

زاہد نے کہا۔

"یہ بیچاری پورے پانچ سال کے بعد یہاں آئی ہے۔ یہی ہے وہ جو میرے ساتھ آنے والی تھی یہ"

مزلہ مسکرا دی لڑکی کو اس نے پہلے کبھی دیکھا ہے شاید یہ اس کا واہمہ تھا۔ اس نے خود اس بات پر غور کیا۔ تو اسے محسوس ہوا کہ یہ لڑکی پہلی ہی بار اس کی آنکھوں کے سامنے آئی ہے۔

اس نے کہا۔

"کیا نام ہے بیٹی تمہارا؟"

لڑکی پھر شرما گئی اور سر جھکا کر بولی۔

"شاہدہ ا۔۔۔"

"بہت پیارا نام ہے۔۔۔"

مزلہ بولی۔

"زاہد کے ساتھ تم ہی نہیں تمہارا نام بھی خوب جچے گا۔۔۔" شاہدہ یار حیا سے زمین میں گڑ گئی۔ مشرقی لڑکی کوئی بھی ہو کہیں بھی رہے جب وہ حیا کا نقاب پہن لیتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کائنات کا سارا حسن سمٹ کر اس کے قدموں پہ آگیا ہے۔۔۔"

---



"کس کی بیٹی ہو ا۔۔۔" مزلہ نے پوچھا۔

"ماں ا۔۔۔"

زاہد نے شاہدہ کی مشکل حل کی۔

"یہ بہت بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کے گھر والے کسی زمانے میں نوابوں سے تعلق رکھتے تھے۔"

نوابوں کا نام سن کر مزلہ کے دل میں ایک ٹھیس سی اٹھی۔ لیکن ایسے موقع پر سنجیدگی اختیار کرنا اپنے بیٹے کے حق میں ناانصافی ہوتی۔

اس لیے وہ بدستور مسکراتی رہی۔

"ماں ا۔۔۔"

زاہد نے پھر کہا۔۔۔

"اب تم شاہدہ کو کھڑا ہی رکھو گی یا بیٹھا کر کچھ کھانے پینے کو بھی دو
گی۔ بے چاری اتنی دور سے آئی ہے۔ تھک گئی ہو گی ــــ"

مزلہ اپنے
بیٹے کی شوخی پر کھلکھلا کر ہنس پڑی شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے صوفے
پر بٹھایا اور پیار سے باتیں کرنے لگی۔ گفتگو کے دوران شاہدہ نے بتایا کہ وہ
کے ایک بہت بڑے بیوپاری کی نور نظر ہے لندن میں پانچ سال گذارنے کے
بعد بھی اسے کوئی ایسا دوست یا سہیلی نہ مل سکی جس کی صحبت میں
بیٹھ کر وہ اپنے ملک کے لوگوں کے متعلق گفتگو کر سکتی۔

زاہد سے
اس کی ملاقات اچانک ہی ہو گئی۔ جب ایک شام لندن کے کچھ غنڈوں
نے اسے گھیر لیا تھا۔ اگر وقت پر زاہد نہ آجاتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ زاہد
میں اس نے وہ تمام خوبیاں پائی ہیں۔ جن کا وہ ہمیشہ خواب ہی دیکھا کرتی
تھی ایک بڑے گھر کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی وہ زاہد کو کبھی دھوکا نہیں دے
گی۔

مزلہ کے دل میں جو واہمہ ایک خدشہ بن کر اٹھ رہا تھا اس کا تدارک
ہو گیا۔ شاہدہ اتنے بڑے گھر کی لڑکی اور اس کا بیٹا ایک غریب انسان
غریبی اور امیری کے درمیان کھڑی دیوار کو توڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔



لیکن شاہدہ
کی باتوں سے اسے دلی اطمینان حاصل ہو گیا۔ پھر بھی اس نے اس کا د
رکھنے کے لیے کہا۔

"زاہد کو سرکاری کنٹریکٹ جلدی ہی ملنے والا ہے۔ کنٹریکٹ ملتے ہی ہم
ایک بنگلے میں چلے جائیں گے۔ پھر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی ــ"
شاہدہ نے اسے تشکر گذاری کی نگاہوں سے دیکھا۔

شاہدہ وہاں بہت دیر تک رہی۔ مزلہ جلد ہی ان دونوں کو تنہا چھوڑ کر
باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ کافی دیر بعد زاہد شاہدہ کو لیے باہر نکلا تو
آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ لیکن افق پر اس جگہ شفق کی سرخی اب تک
بکھری ہوئی تھی۔

جہاں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے چھپے ہوئے تھے۔ ورنہ کالی بدلیوں
کی دبیز پرتیں کئی جگہ جمع تھیں۔

"بس اتنی ہی دیر کی ملاقات تھی ا ــ"
زاہد نے اس کی نرم و نازک انگلیاں اپنے ہاتھ میں اسیر کرتے ہوئے
پوچھا ــ

شاہدہ کی آنکھوں میں حیا کی سرخی سمٹ آئی۔ کار سامنے کھڑی
تھی۔ لانبی چوڑی، سفید برف جیسی غیر ملکی کار، اس نے ایک جانب

کا اگلا گیٹ کھولا اور بولی۔

"اچھا بیٹھو!۔۔۔"

زاہد کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ جھٹ کار میں بیٹھ گیا۔ شاہدہ بھی دو سے ہو کر اسٹیرنگ پر جا بیٹھی زاہد نے جھانک کر اپنے فلیٹ کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کا پردہ ہل رہا تھا۔ شاید ماں انہیں دیکھ رہی تھی اور دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

اس کے

بیٹے کو اس کے خوابوں کی تعبیر بن ایک حسین شریک حیات مل گئی ہے۔ ماحول بھیگا بھیگا تھا۔ ہوا کچھ سرد تھی پھر بھی شاہدہ نے کار کی چھت کھول دی جہاں دو جوان دل ایک دوسرے کی قربت پر دھڑکتے ہوں وہاں سردی گرمی، برسات کچھ بھی اثر نہیں کرتی ہوا کے نرم جھونکے پھولوں کی قربت کا لطف دے رہے تھے۔

شاہدہ نے کار کی رفتار تیز کر دی اور ڈھلتی شام کے رنگین ماحول میں چوڑی سڑک پر اسے چھوڑ دیا۔ موڑ پر جب وہ اپنی مرمریں بانہوں کو کے لوچ کے ساتھ موڑتی تھی تو پہیے چیخ چیخ اٹھتے تھے گاڑی کے جھٹکے کے ساتھ وہ شاہدہ پر گر گر جاتا تھا۔ اور تب شاہدہ کی ریشمی لٹیں اس کے رخساروں سے چھو چھو جاتیں۔ اس کے بالوں کی مست نشیلی خوشبو اس



کے نتھنوں کو سیراب کر دیتی۔

زاہد جب اپنے آپ کو ان لٹوں سے علیحدہ کرنا چاہتا تو شاہدہ اس کا ہاتھ تھام لیتی پھر اس کی گردن میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال کر ہونٹوں کو آہستہ سے دبا کر مسکرا دیتی۔

زاہد کو

وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی غریبی کا احساس نہیں دلانا چاہتی تھی۔ زاہد دزدیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ شاہدہ کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتی تھی بلکہ اُس کے احساس کو بھڑکانے کے لیے وہ اپنے سڈول جسم کو اس کے اور قریب کر دیتی تو زاہد شرم سے گردن جھکا لیتا۔

"کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟۔۔۔"

جب گاڑی شہر سے کوسوں دور نکل کر ایک کھلی سڑک پر بھاگنے لگی اور جب شام تاریکی میں بدلنے لگی تو زاہد نے پوچھ ہی لیا۔

"معلوم نہیں!۔۔۔"

"معلوم نہیں؟۔۔۔"

"ہاں!۔۔۔"

"لیکن!۔۔۔"

"بس یونہی چلے جا رہے ہیں۔ تاکہ تمہیں احساس نہ ہو کہ ہماری ملاقات
صرف تھوڑی دیر تھی۔"

شاہدہ نے کہا۔

"وقت ہی گذارنا ہے تو گاڑی دھیمے چلاؤ نا ——"

زاہد اُس کی لاپرواہی سے گھبرا رہا تھا

"گاڑی تیز چلانے میں مجھے لطف آتا ہے۔"

شاہدہ بولی۔

یاد نہیں لندن میں ہم جن سڑکوں پر گاڑی چلاتے تھے وہاں رفتار دھیمی
رہے تو حادثہ ہو جاتا ہے۔

"وہ لندن تھا میم صاحبہ اور یہ پاکستان ہے گاڑی آپ دھیمے ہی چلائیے
ورنہ سچ مچ حادثہ ہو جائے گا ——"

"ہو جانے دو"

شاہدہ نے رفتار اور بڑھا دی

"حادثے سے آدمی زخمی ہو جاتا ہے ——"

"ہو جانے دو نا ——"

"لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارے حُسن پر ایک بھی داغ لگے ——"

شاہدہ نے کار دھیمی کی —— بہت دھیمی —— پھر بہت آرام سے



چلاتے ہوئے اُس نے پوچھا ——

"اتنا پیار کرتے ہو۔"

"اس سے بھی زیادہ"

زاہد نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا ——

اچانک شاہدہ نے سڑک کے کنارے کار روک دی جہاں سڑک کا
ڈھلوان تھا۔ انجن بند کرنے کے بعد...... اُس نے زاہد کی آنکھوں
میں جھانکا۔

بہت قریب

سے اپنا چہرہ زاہد کی آنکھوں کے قریب کر دیا۔ اتنا قریب کر دیا یہاں
تک کہ زاہد اُس کی گرم سانسوں کا لمس محسوس کرنے لگا۔ اپنے لب اُس
کے لبوں کے قریب کر کے وہ نرم مترنم آواز میں بولی۔

"تو پھر کرو نا پیار نا ——"

زاہد بوکھلا کر یوں لجا گیا جیسے وہ خود ہی ایک لڑکی ہو۔

شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بدلیوں سے بارش کی پھوار پھول کی پنکھڑیوں
کی طرح جھڑنے لگی تھی۔

شاہدہ نے گاڑی کی چھت نہیں اٹھائی وہ اسی طرح کھلکھلا کر ہنستی رہی
اور بجلی کی چمک میں زاہد نے دیکھا۔ شاہدہ کے چھوٹے چھوٹے موتی جیسے

سفید دانت بارش کی پھوار میں مدغم ہو کر اولوں کی طرح جھلک رہے تھے۔
شدت جذبات سے بے قابو ہو کر اس نے شاہدہ کو بازوؤں کے
ہالے میں لے کر سینے میں چھپا لیا بارش کی بوندیں اپنے اندر لطیف
مٹھاس لیے ان پر چھا گئیں۔ شاہدہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بٹن دبا کر کار
کی چھت بند کر دی۔

زاہد نے
بھی اپنی طرف کی کھڑکی بند کر دی۔ شاہدہ ایک شوخ اور چنچل لڑکی
تھی۔ اچک کر وہ پیچھے کود دی تو دوسری جانب کا گیٹ کھول کر باہر کی
طرف سے ـــــ وہ بھی پیچھے جا بیٹھا۔ سردی کافی تھی۔ اس لیے دونوں نے
شیشے بھی اچھی طرح بڑھا دیئے۔

پھر ایک کی نظریں دوسرے کی نگاہوں سے ہم آغوش ہوئیں۔ اندھیرے
میں بھی دونوں جذبات کے جھروکوں سے ایک دوسرے کو جسم کے آر
دیکھ رہے تھے۔ سردی کی شدت سے شاہدہ اپنے آپ ہی میں سمٹی
جا رہی تھی۔

جسم پر ریشمی ساڑھی بھیگ کر چپک گئی تھی اندھیرے میں بھی اس کے
جسم کا عضو عضو شیشے کی طرح جھلک رہا تھا۔ سیاہ لٹیں نم ہو کر
پر چپک سی گئی تھیں۔ پلکوں پر بوندیں موتیوں کی طرح ٹھہری ہوئی



لا اُس کی سانسیں اتنی گہری تھیں کہ ان کی آواز سننے کے ساتھ ساتھ اس
کی چھاتی کا زیر و بم بھی بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ شاہدہ نے اسے بہت
غور سے دیکھا۔ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایسی پرکشش شیرینی تھی
کہ وہ صبر نہ کر سکا تو اس نے شاہدہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ پوری قوت
سے اُسے اپنے سینے میں سمو لیا۔ کچھ اس والہانہ انداز سے کہ اتنی بڑی گاڑی
بھی ہل گئی ـــــ"

---

دو جوان دھڑکنیں ایک دوسرے پر کان لگائے کچھ کہتی رہیں کچھ سنتی رہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتی رہیں۔ یہاں تک کہ انہیں بہت دیر ہو گئی۔ بجلی کڑکتی رہی اور اُس کی کوندے دور دور تک رات کی دبیز تاریکی بارش کی رم جھم میں ایک سنہرے خواب کی شکل میں منعکس ہوتی رہی۔

بادل کی

گرج رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ کار کے شیشے بند ہونے کے باوجود ان کا شور اندر تک پہنچ جاتا تھا۔ بارش کی موٹی موٹی بوندوں سے کار کی چھت پر ایک پیار بھرا سرگم سا بج رہا تھا۔ جس کی مٹھاس بھری لے کے سحر میں وہ بے خود ہو چلے تھے، ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ کوئی بندش نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے سوا وہاں اور



کوئی نہ تھا۔ وہ آزاد تھے۔ شہر سے کوسوں دور ایک سنسان سڑک کے کنارے جہاں ایسے بھیانک ماحول میں کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا ہے۔

جب وہ

ہوش میں آئے تو طوفان ختم ہو چکا تھا۔ باہر کے ماحول کا بھی اور اندر کے ماحول کا بھی۔ یہ طوفان ایک انجانے راستے سے ایک زلزلے کی صورت میں آیا تھا۔ اتنی تیزی کے ساتھ کہ دم زدن میں ان کے دلوں کی دنیا اتھل پتھل کر گیا۔

کچھ پتہ بھی نہیں چلا اور سب کچھ برباد ہو گیا۔ محبت کے ان دیوانوں کا۔ اور وہ اس کی لپیٹ میں آکر اپنا راستہ کھو بیٹھے تھے۔ خاموشی مسلط تھی ایک پراسرار خاموشی اندر بھی اور باہر بھی۔

جسے توڑنے کے لیے زاہد کے پاس زبان نہیں تھی اور شاہدہ کے پاس نظر ملانے کو آنکھیں نہیں تھیں —— آنکھیں ہوتے ہوئے بھی وہ اندھی ہو گئی تھی۔

"زاہد ——"

آخر کسی کو تو کچھ کہنا ہی تھا —— اس لیے شاہدہ ہی نے کہا۔ اس کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔

شوخی ماحول کی سنجیدگی میں مدغم ہو چکی تھی۔ اُس نے کہا۔

"مجھے چھوڑو گے تو نہیں؟ ——"

"مر کر بھی نہیں شاہدہ! ——"

زاہد نے نظریں چرا کر اُسے اپنے سینے میں چھپا لیا ——

"میں کل ہی ماں کو تمہارے گھر بھیجوں گا ——"

شاہدہ کے دل کو ساون ملا لبوں پر تبسم کی ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ مگر یکایک بولی۔

"ماں کو کل نہیں پرسوں بھیجنا۔ ممی اور ڈیڈی باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور کل رات ہی میں واپس آئیں گے۔ اگر وہ گھر پر موجود ہوتے تو میں تمہارے پاس اتنی دیر نہ ٹھہر سکتی ——"

زاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔

صبح نمودار ہو چکی تھی تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ مزلہ گھر کا کام کاج کرنے کے بعد فرصت سے بیٹھی ہی تھی کہ زاہد بھی کرسی کھینچ کر اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اُس نے رازدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ ماں کو دیکھا۔

ماں کو سمجھنے دیر نہیں لگی کہ آج کوئی خاص بات ضرور ہے جواب میں وہ بھی مسکرائی۔



"کیا بات ہے بٹیا! ——"

اپنے دل کے ٹکڑے کے دل کی بات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے محبت سے پوچھا۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو؟ ——"

"ہاں ماں وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

زاہد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح گفتگو کی ابتداء کرے پھر بھی اُس نے کوشش کی اور کہا۔

"وہ جو شاہدہ ہے نا! ۔ وہی جو کل آئی تھی ——"

زاہد اپنا سر کھجلانے لگا۔

"ہاں۔ ہاں وہی جو کل آئی تھی۔ مجھے یاد ہے میں اتنی جلدی اُسے نہیں بھول سکتی ——"

مزلہ اپنے بیٹے کی تشویش سے لطف اندوز ہوئی۔

"کیا کیا ہے اُس نے۔ کیا وہ تجھے پسند نہیں ہے؟ ——"

"اللہ! اللہ! ماں کیسی باتیں کرتی ہو ——"

زاہد فوراً بولا۔

"مجھے تو اتنی زیادہ پسند ہے اتنی زیادہ اتنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"مجھ سے بھی زیادہ؟ ——"

مزلہ نے پوچھا۔

"اوہ! ماں تم تو میرے لیے سب کچھ ہو ماں! تمہارے قدموں میں تو میں اپنی ........"

"اچھا اچھا بس رہنے دو ـــــ"

مزلہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولی۔ مبادا ایسی نیک گھڑی میں وہ کوئی بری بات کہہ جائے ـــــ

"میں آج ہی شاہدہ کے گھر جاؤں گی پتہ دے دینا۔ کیا نام بتایا۔ اُس نے اپنے والد کا ـــــ ہاں خان اشرف خاں ـــــ"

"آج نہیں ماں۔ کل جانا۔ کل ـــــ"

زاہد نے اپنی مسرت پر قابو پانے کی سعی کی ـــــ

"آج تو اس کے ممی اور ڈیڈی باہر سے واپس آئیں گے۔"

مزلہ چپ ہوگئی

اپنے بیٹے

کی بے پناہ مسرت کا اندازہ لگا کر جب وہ خود بھی مسکرائی تو زاہد اٹھ کر اُس کے گھٹنوں سے لپٹ گیا۔

تبھی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زاہد فوراً باہر پہنچا۔ سامنے پوسٹ مین کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رجسٹری تھی۔ جو اسی کے نام تھی۔ اُس نے



اسے کر اُلٹ کر دیکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً ہی دستخط کئے اور لفافہ کھولتا ہوا۔ ماں کی طرف بڑھا۔ خط پڑھتے ہی فرط مسرت سے چیخ اٹھا۔

"ماں مجھے کنٹریکٹ مل گیا ـــــ"

"کیسا کنٹریکٹ ہے ـــــ"

مزلہ نے پوچھا۔

"وہی جس کے لیے تو نے خط و کتابت کی تھی ہے ـــــ"

"ہاں ماں وہی۔"

زاہد اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

اور منسلک کاغذات کو گھٹنوں پر پھیلا دیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ ان کاغذات میں کھو سا گیا۔ کیونکہ یہ کاغذات اُس کی کامیابی کے لیے ایک کھلا چیلنج تھا۔ سرکاری ٹھیکے تھے۔ جنہوں نے ملک میں بہترین کالونی، فیکٹریاں اور عمارتیں تعمیر کرائی تھیں زاہد کو ایک آرکیٹیکٹ کی حیثیت سے مقرر کر کے اُنہوں نے اس کے ذمے ایک چھوٹے سے شہر کو تعمیر کرنے کا کام سونپا تھا۔ اپنی قابلیت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلا موقع تھا۔

جس میں وہ کسی بھی کمی کی گنجائش نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک نقشہ کھولا کسی اُجڑے ہوئے علاقے کا نقشہ جسے نئی شکل دینے کے لیے

اُسے اپنی طرز کا ایک نیا نقشہ تیار کر کے کمپنی کو پیش کرنا تھا۔ نیا نقشہ تیا
کرنے سے قبل یہ ضروری تھا کہ وہ عملی طور سے اس علاقے کا دورہ کرے اور چپے
چپے کا معائنہ کرے۔ کمپنی نے اُس کے لیے ساری سہولتیں دے دی تھیں۔

ملتان شہر

سے تقریباً پچیس میل دور کریم نگر کا ایک بہت بڑا علاقہ تھا۔ جو بر
سے ویران پڑا تھا۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھا کوئی مکان بھی نہ تھا
جگہ جگہ ٹوٹی پھوٹی دیواریں یا کھنڈرات اس بات کی نشاندہی کرتے تھے
عہد رفتہ میں یہاں آبادیاں رہی ہوں گی۔

ورنہ حد نظر تک سپاٹ میدان ہی دکھائی دیتے تھے ناہموا
سروے کی رپورٹ کے مطابق تقریباً دس سال قبل یہ جگہ آباد تھی۔ لیکن
تین سال تک سیلاب آتے رہنے کی وجہ سے یہاں کے باشند
نے یہ جگہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی۔ کل علاقے میں صرف ایک ح

ہی باقی تھی۔

جس کا

آخری وارث نواب ارجمند خاں تھا۔ اس کا بھی اب کوئی پتہ نہ
تاہم حکومت ایک ماہ کا نوٹس دے کر اس حویلی کے وارث کا پتہ لگا
کی کوشش کرے گی اس دوران میں اگر اس حویلی کا کوئی وارث نہ ملا



نیلام یا مسمار کرنے یا پھر ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے کا حکومت کو پورا
حق ہوگا۔

کمپنی نے اس علاقے کو مدنظر رکھنے کی تاکید کی تھی کہ نقشے کی تکمیل میں
حویلی کا عکس قطعاً نہ آنا چاہیے کیونکہ نقشہ پاس ہو جانے کے بعد اگر حویلی
کا کوئی وارث پیدا ہو گیا۔ تو کالونی کی تعمیر میں رخنہ پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔
ایسی صورت حال میں از سر نو دوسرا نقشہ تیار کرنا پڑے گا۔

جس سے اخراجات میں اضافہ ہو جائے گا اس لیے بہتر ہوگا اگر اس
خطرے کو مول لینے سے احتراز کیا جائے۔ زاہد سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ حویلی
تو کریم نگر کے وسط میں ایستادہ ہے۔

سب سے اونچی سطح پر ——— اور یہ حقیقت بھی تھی کہ نقشے میں
اس کا عکس آئے بغیر اس کے اردگرد ایک نئی کالونی کی تعمیر کرنا اس
کے لیے ایک مشکل امتحان سے گزرنا تھا۔ لیکن کریم نگر جائے بغیر اس
کا کوئی حل تلاش کرنا یا کوئی ٹھوس فیصلہ کرنا یقیناً ایک مشکل کام تھا۔
بہت سنجیدگی سے وہ دوسرے کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ اسی
تگ و دو میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ اس کی ماں اُسے غور سے دیکھ رہی تھی ——

---

"کیا بات ہے بیٹے؟ ——"

مزلہ نے اُسے متفکر دیکھا۔ تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"کچھ نہیں ماں! بس ایک نئے شہر کو تشکیل دینے کے متعلق سوچ رہا ہوں ——" زاہد نے کہا۔

"یہ کمبخت کنٹریکٹ بھی ملا تو ایسا سخت کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے ——"

"کیوں کیا ہو گیا؟ ——"

مزلہ خود بھی فکر مند ہو گئی۔

"کریم نگر علاقے کے وسط میں یہ حویلی جانے کہاں سے آٹپکی۔"

زاہد نے لاپرواہی سے کھسیا کر کہا۔



"اب جا کر دیکھیں تو حقیقت کا پتہ چلے گا ——"

"کریم نگر"

مزلہ

کا

دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ہاں! ماں ——"

زاہد کاغذات پر جھکا ہوا بولا۔

کسی زمانے میں یہ ایک نواب کی جاگیر تھی۔

"نواب ارجمند خاں کی؟ ——"

"ہاں! ——"

زاہد کے ہاتھ سے کاغذات چھوٹتے چھوٹتے بچے اس نے حیرت واستعجاب سے اپنی ماں کو دیکھا۔

"تو وہاں نہیں جائے گا تو وہاں ہرگز نہیں جائے گا ——"

مزلہ فوراً

فکر مند ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں ماں! ——"

زاہد بھی کاغذات ہاتھ میں لیے کھڑا ہو گیا ——

"آخر کیوں ؟ میں وہاں نہیں جا سکتا! ——"

"تو نہیں جانتا بیٹا وہ لوگ کتنے بھیانک ہیں۔"

مزلہ ایک

نئے اندیشے کے زیر اثر بولی۔

"اگر انہوں نے تجھے پہچان لیا تو جانے کیا کر گزریں۔ میں تجھے وہاں ہرگز ہرگز نہ جانے دوں گی۔"

"لیکن کون مجھے پہچان لے گا ؟ آخر کون ہے جو میرے انجانے میں میرا دشمن بنا بیٹھا ہے ؟"

"وہی بیٹے! وہی اس حویلی کا نواب۔ نواب ارجمند خاں۔"

"لیکن ماں! اب وہاں ہے کون۔ وہ تو ایک لاوارث حویلی ہے۔ جو کبھی رنگ محل کے نام سے مشہور تھی۔"

مزلہ سے کچھ پرے ہٹتے ہوئے زاہد نے کہا۔

"کیا ؟ ——"

مزلہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں زاہد کی بات پر اسے یقین ہی نہیں آیا۔

"یہ دیکھو ——"

زاہد نے پاس کی میز پر نقشہ پھیلا کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"ملتان سے تقریباً پچیس میل دور یہ سامنے کا سارا کریم نگر کا علاقہ اور



یہ حویلی رنگ محل ، جس کا آخر وارث نواب ارجمند خاں تھا۔

مزلہ نے

اسے

حیرت سے دیکھا۔ آواز حلق سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"ہاں ماں! ——"

زاہد نے کہا۔

"کبھی یہ علاقہ گنجان آبادی سے ضرور بھرا ہوگا مگر اب تو یہ بالکل اجاڑ ہے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ سروے کی رپورٹ کے مطابق اس علاقے کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کے درمیان یہ حویلی بھوت محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے قریب سے ہو کر گزرنے والے کا دل خوف سے لرز اٹھتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس حویلی کے مکینوں اور اس حویلی کو کسی کی آہ ڈس گئی ہے اس کی خوشیوں کو غریبوں کی چیخ و پکار نے نگل لیا ہے ——"

"نہیں نہیں بیٹے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ——"

مزلہ

یکایک بولی۔

اس کے دل کو ایک عجیب سے دکھ کا احساس ہوا جیسے وہ خود

بھی نہیں سمجھ سکی۔ اُس کے اندر کی عورت جاگ اٹھی اور ایک مرد،عورت کی روح اُس کے دل میں پیدا ہوگئی۔ جس کا اُس نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔

عورت کیا

ہے۔ عورت کیا چاہتی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتی۔ عورت کبھی کبھی اس کے تصوّر سے بھی تڑپ اٹھتی ہے۔ جس سے وہ سخت نفرت کرتی ہے۔ اور جب یہ تڑپ دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے تو اُسے لعنت ملامت کرنے اور کوسنے کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

لیکن جب زندگی کے ایک موڑ پر پہنچ کر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی آہ بے کار نہیں گئی۔ اس کی آہ اُس کے ارمانوں کے قاتل کو کھا گئی ہے اور اس قاتل نے مرتے دم بھی اسی کو یاد کیا ہوگا وہ پچھتایا ہوگا۔ رویا ہوگا اس کے لیے تڑپا ہوگا۔ تو اُس کی ساری نفرت اچانک ہی سجدوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس وقت

مزلہ کی زندگی میں بھی اچانک ایسا ہی موڑ سا آگیا۔ اور نواب ارجمند کے انجام کا تصور کر کے اس کے دل میں سخت درد اٹھا۔ اس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اپنی کالی زبان کو اس نے لعنت ملامت



جن کے ذریعے نواب ارجمند کے حق میں ایسے الفاظ کہے تھے۔ کچھ بھی ہو نواب ارجمند اس کے بیٹے کے والد تھے۔ وہی ناک نقشہ، چال ڈھال انداز گفتگو سب کچھ ان ہی جیسا تھا۔ عہدِ رفتہ کے وہ لمحات اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے۔

جو اس

نے کبھی ان کے قرب میں رہ کر گذارے تھے اور وہ آخری ملاقات کی چند ساعتیں جب وہ اس کے سامنے دوزانو ہو کر اس سے معافی کے طالب ہوئے تھے۔ محبت کی بھیک مانگی تھی مزلہ کا دل پھٹ گیا ——

آنکھیں چھلک پڑیں۔ یقیناً یہ سب اس کی آہ کا ردِّ عمل ہے جس نے نواب ارجمند خاں کا سب کچھ لوٹ لیا۔ عزت و وقار۔ دولت و امارت جاہ و حشمت کچھ بھی تو نہیں بچا ——

"ماں! ——"

زاہد نے اپنی ماں کی حالت دیکھی تو گھبرا کر حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری آنکھوں میں آنسو! ——"

"بیٹا! ——"

مزلہ نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ آنکھوں کے آنسو جذب کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے بیٹے! بس کچھ یاد آگیا تھا۔ اسی لیے آنکھیں نم ہوگئیں ——"

"مجھے جاننے کا حق ہے ؟ ــــ"

"نواب ارجمند خاں تیرے باپ کے خاص دوست تھے ــــ"

مزلہ نے حقیقت کو پردۂ راز میں رکھا حقیقت کا انکشاف کرنے کا اب سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ اتنے عرصے تک جس راز کو وہ ہر طرح سے چھپاتی چلی آئی تھی۔

اب اس

کا انکشاف کر دینے کے بعد وہ اپنے بیٹے کا پیار بھی کھو سکتی تھی کیونکہ اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ بیوہ ہے زاہد بھی بچپن ہی سے اسے ایک مصیبت زدہ عورت کے روپ میں دیکھتا آیا تھا۔ اب وہ کس طرح اسے بتا سکتی تھی کہ نواب ارجمند نے اپنی ہوس کی آسودگی کے خاطر اسے اس کا بیٹا بنا دیا تھا؟

بلاشبہ زاہد کو خود سے نفرت ہو جاتی۔ اپنی ماں ــــ اس سماج سے ــــ ساری دنیا سے نفرت ہو جاتی۔ سماج کو چہرہ دکھانے کی بجائے وہ خودکشی کو زیادہ ترجیح دیتا۔ کس طرح کسی سے نظر ملا کر بات کرنے کی جسارت کرتا۔

کس کس

کے رات دن طعنے سنتا ؟ کون ہے اس کا باپ ؟ کون ہے اس کا باپ ؟ کیا اس کا بیٹا دوسروں کو یہ جواب دیتا پھرتا کہ اس کی رگوں



میں نواب ارجمند کے خاندان کا خون ہے ایسا خاندان جس کی بنیاد میں معصوم دلوں کی تمنائیں دفن ہیں۔ جس کی اینٹ، پتھر اور گارے میں غریبوں کی رگوں سے نچوڑا گیا خون شامل ہے۔

جس کے

خاندان کی تاریخ علاقے کی حسین دوشیزاؤں کی مسکراہٹیں چھین کر لکھی گئی ہے۔ کیا یہ سب باتیں قابل فخر ہیں ؟ کس طرح زاہد دنیا والوں کے سامنے منہ کھولتا کہ وہ ایک ایسے نواب کا بیٹا ہے جس کی باہنوں میں آرام کرنے کو ہر شب ایک نہ ایک خوبصورت دوشیزہ کا ہونا لازمی سمجھا جاتا تھا ؟

اس جیسے تو جانے کتنے زاہد اور بھی ہوں گے جو نہ معلوم کہاں کہاں کیچڑ میں سانس لے رہے ہوں گے یہی وجوہات تھیں جن کے سبب سے مزلہ نے اپنی حقیقت پر پردہ ڈالے رکھا اور اس طرح اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کے حق میں ایک خوشگوار مستقبل کی تشکیل کی اور اس کے لیے ایک راستہ متعین کر دیا تھا ــــ

---

اسی راستے پر چل کر آج زاہد اس بلندی پر پہنچا تھا اور جب تک یہ بھید پردۂ راز میں رہے گا زاہد کے اپنے آپ سے نفرت کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس وقت

بھی اس نے اس راز کے بے چہرے کو جھوٹ کے نقاب میں لپیٹ کر حقیقت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن نہیں معلوم کیوں عورت کا دل کبھی ایک ہی مرکز پر نہیں رہتا۔ نواب ارجمند کی تباہی کے پیشِ نظر اس وقت جو ہمدردی کا جذبہ اس کے دل میں موجزن ہو گیا تھا اس کا وہ کیا کرے۔

"بٹیا! ——"

مزلہ نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔



"تجھے کب کریم نگر جانا ہے؟ ——"

"بس کل ہی نکل جاؤں گا ماں، آج ہی کمپنی کے چند نوکر یہاں آ جائیں گے۔"

"تو پھر میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی بیٹے! ——"

مزلہ نے جواب میں کہا۔

"ماں! ——"

"ہاں بیٹے! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل ——"

مزلہ نے جیسے اس سے التجا کی۔

"مجھ سے صبر نہ ہو سکے گا ——"

"لیکن ماں، تمہیں تو کل شاہدہ کے یہاں جانا ہے ——"

"تجھے میری قسم بیٹے! ——"

مزلہ فوراً بولی۔

"وہاں سے واپس آتے ہی میں فوراً شاہدہ کے ہاں چلی جاؤں گی۔"

زاہد

ماں

کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

کریم نگر میں اسے دن ہی کتنے لگیں گے۔ اگر سروے کرنے میں زیادہ وقت لگا تو ماں کو وہ یہاں واپس پہنچا دے گا۔ لیکن شاہدہ کے ساتھ

ازدواجی رشتہ استوار کرنے میں وہ ہرگز تاخیر نہ کرے گا۔

ابھی وقت

کافی تھا وہ ماں کو شاہدہ کے گھر بھیج سکتا تھا لیکن آج وہاں بھیجنا لاحاصل ہوتا کیونکہ آج رات شاہدہ کے ممی ڈیڈی باہر سے واپس لوٹیں گے ماں کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا مزلہ کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

آفتاب غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اسی درمیان کریم نگر میں ایک مقام پر ایک اسٹیشن ویگن اور جیپیں رکیں۔ جیپ کے ٹریلر پر کافی سامان لدا ہوا تھا۔ حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک اچھا خاصا ہموار مقام تھا جو خیمہ نصب کرنے کے لیے بہت مناسب تھا لوگ گاڑیوں سے اتر پڑے۔

کچھ لوگ خاکی کپڑے اور خاکی ہیٹ پہنے ہوئے تھے زاہد آخری جیپ سے اترا اور ساتھ ہی مزلہ بھی اتر پڑی چہرے پر درد و غم کے سائے لہرا رہے تھے سب سے پہلے اس نے اپنی نظریں حویلی کی جانب پھیلا دیں کریم نگر کی دنیا میں صرف یہی ایک حویلی بچی تھی۔

جو آخری سانس لے رہی تھی۔ بالکل خاموش اجڑی اجڑی اب یہاں رہنے والے کو بھی خوف۔ لگتا ہو گا حویلی کے اس پار دور تاڑ کے درختوں کی چوٹیاں جھانک رہی تھیں جہاں کچھ گدھ چپ چاپ بیٹھے ان لوگوں کی آمد پر حیرت سے اپنی خوراک کے منتظر تھے۔



اس علاقے

میں کسی جانور کا بھٹک کر آ جانا اور سوکھا پا کر بھوک سے بلک بلک کر دم توڑ دینا معمولی بات تھی۔ حویلی کی دیوار کائی دار کالی پڑ چکی تھی قریب سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی حالت اور بھی بھیانک اور کمزور ہو گئی ہے۔

مزلہ کے لبوں سے ایک آہ ٹپک گئی عہد رفتہ کی شان و شوکت تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے ابھر آئی۔ یہ وہ تصویر تھی جب نواب ارجمند بالا خانے میں بیٹھ کر لوگوں کی فریادیں سنا کرتے تھے۔

مزلہ نے دیکھا کہ حویلی کے مقابل کا وہ درخت آج بھی ہے لیکن اس کی ٹہنیاں سوکھ چکی ہیں۔ شاخیں کانٹوں کی طرح نوکدار دکھائی دے رہی ہیں جڑ ٹوٹا ہوا اور لرزیدہ نظر آ رہا ہے۔

یکایک اس کے ذہن میں اپنے باپ اور بہن کی یاد تازہ ہو گئی۔ کس طرح وہ ان حادثات کو بھلا سکتی تھی کسی بھی حالت میں نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ اچانک ہوا کا ایک جھونکا ٹینٹ کے پیچھے سے آ کر اس کی سفید ساڑھی کا آنچل اڑا کر گذر گیا۔ جس کے ساتھ ہی ایک ناخوشگوار بو اس کے نتھنوں کے اندر سرایت کر گئی۔ اس نے ساڑھی کا آنچل ناک پر رکھا اور پلٹ کر دیکھا۔ کافی دوری پر کوئی جانور مرا پڑا تھا۔ گدھ اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا چکے تھے اور باقی ماندہ پر کوے جھپٹے

ہوئے تھے۔ اس کے خیال میں یہ جانور ادھر بھٹک کر ہی آ گیا ہو گا۔ اُس نے
تک نگاہیں پھیلا دیں ——— وہ ......... وہ جو گھنا برگد کا درخت
ہے۔ وہ تو آج بھی جوں کا توں تنومند کھڑا ہے۔ صرف اس کی جڑ کے پاس ایک
چھوٹا سا چبوترہ نہیں ہے۔ جو ہوا کرتا تھا۔

لیکن معاً اسے خیال آیا کہ جس جگہ خدا کی خلقت نہیں۔ وہاں کچھ بھی نہیں
وہاں سے نظریں ہٹا کر اُس نے دوسری جانب جما دیں جہاں ببول
ایک اور درخت تھا۔ اسی ببول کے درخت کے نیچے اُس کا اپنا گھر تھا۔
چھوٹا سا معمولی سا گھر دور گھر کے اس پار اس کے کھیت تھے۔ آج وہاں
کچھ بھی نہیں۔ سوائے بڑی بڑی گھاس کے جو اس وقت جنگل کی طرح نظر
آ رہا ہے۔ اسی کھیت کے قریب والے کھلیان میں تو بھولا نے جیون بھر
کا ساتھ دینے کی قسم کھائی تھی۔ لیکن کمبخت چند سکوں کے عوض میں بک
گیا تھا۔

اُس نے

اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ زندگی میں لوگ بے وفائی کرتے ہیں
کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا
نہ اس کے ساتھ قسمیں کھائی تھیں۔ اس کے ساتھ مرنے کا وعدہ کیا تھا۔
ساتھ ہی مریں گے ساتھ ہی جئیں گے۔ یہی اس نے کہا تھا۔ لیکن



لالہ کے ہاتھوں بک گیا تھا۔ کیا دولت ہر انسان کو خرید لیتی ہے۔ نہیں ——— یہ
نہیں ہو سکتا۔ بے ضمیر لوگ ہی دولت کے ہاتھوں بکتے ہیں۔

اُسے بھی تو دولت سے خریدنا چاہا گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں بکی تھی۔ اُجڑ گئی
برباد ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا تھا۔ اُسے نواب
ارجمند خرید نہ سکا تھا۔ بھولا کتنا غلط انسان تھا۔ جو بک گیا تھا۔

کیا محبت اسی کو کہتے ہیں ——— کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ محبت
ایک سراب ہے ایک دھوکہ ہے محبت جس کے ذریعے ایک انسان
دوسرے انسان کو دھوکہ دیتا ہے۔ بھولا نے کہا تھا۔

"میں تمہارے لیے جان دے دوں گا ———"

مگر اس نے جان تو نہ دی تھی۔ بلکہ اُسے چھوڑ دیا تھا۔ اور اسے بُرا
بھلا بھی کہا تھا۔ وہ بھی عجیب وقت تھا ——— بھولا اور وہ کھیتوں میں
ملا کرتے تھے ——— بھولا نے کہا۔

"مزلہ! ———"

"ہوں!! ———" مزلہ بولی۔

"تم بہت پیاری ہو!! ———"

"پیاری ہوں!! ———"

"ہاں! ———"

"کتنی پیاری ہو!"

"بے حد پیاری!" وہ بولا "تم مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو!!"

"تم مجھے کتنا پیار کرتے ہو!"

"میں تمہیں بتا نہیں سکتا!"

"کیا نہیں بتا سکتے!"

اُس نے

پیار سے پوچھا۔

"یہی کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں!"

وہ اُسے نشہ بار نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"اتنا پیار کرتے ہو — جتنا گہرا سمندر ہے!"

وہ افق میں دیکھ کر بولا۔

"ہاں اتنا ہی گہرا پیار کرتا ہوں — یوں سمجھ لو۔ میں تمہیں سمندر سے بھی گہرا پیار کرتا ہوں — میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں میرے پاس الفاظ نہیں کہ بیان کر سکوں!"

"بس بس رہنے دو! سب جھوٹ ہے!!"

اُس نے ہنس کر فوراً کہا۔



"خدا قسم سچ ہے! — میں اس طرح پیار کرتا ہوں جس طرح چکور چاند کو پیار کرتا ہے۔ شمع کو پروانہ کرتا ہے۔ گل کو بلبل کرتا ہے۔ سمجھ لو میرا پیار ایسی ندی کی طرح ہے۔ جو اچھلتی کودتی دریاؤں میں گرتی ہے۔ میں ندی اور تم دریا — میں تم سے کسی صورت الگ نہیں رہ سکتا!"

اُس نے ایک آہ بھری۔

کتنے دعوے کئے تھے بھولا نے۔ کتنا بڑا جھوٹ بولا تھا۔ اُس نے بھولا کو سمجھا یا تھا ایک مرد — ایک طاقتور مرد تھا وہ۔ اور اس نے کیا کیا تھا۔ ایک کمزور عورت سے بھی مات کھا گیا تھا۔ بھولا ایک گیا تھا — کیا سب مرد ہی ایسے ہوتے ہیں شاید۔

بھولا بک گیا تھا۔ بکنے کے بعد بھی وہ کون سا امیر بن گیا ہوگا۔ روپے
کی حقیقت ہی کیا ہے۔ آتے ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ بھولے نے اپنا ضمیر
بیچنے کے باوجود اس روپے سے کتنا عرصہ گذارہ کیا ہوگا۔ آخر کار پھر بھوکا ہو
گیا ہوگا۔

اور اب

جانے کہاں کدال چلا رہا ہوگا ــــ جانے کہاں اپنے گندے لہو کا پسینہ
بہا رہا ہوگا۔ اس نے محبت بھی کی تھی۔ تو ایک بے ضمیر انسان کے ساتھ
بھولا کو انسان کہنا ہی گناہ تھا۔ انسانیت کی تضحیک تھی۔

جو انسان

چند سکوں کے عوض بک جائے وہ انسان نہیں۔ جانور ہے۔ اس لیے



کہ جانور روز بکتے ہیں۔ اور بکتے ہی رہتے ہیں۔ اُس نے یکایک گردن جھٹک
کر بھولا کے خیال کو بھی جھٹک دیا۔ اور پھر اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ کیونکہ
اُس کا بچپن یہاں گذرا تھا۔

کبھی یہ آباد اور سرسبز علاقہ تھا اور وہ ایک ہرنی کی طرح یہاں قلانچیں
بھرتی پھرا کرتی تھی اور آج کیا تھا۔ وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ وقت کے بے رحم
ہاتھوں نے اُس کے بالوں میں سفیدی بکھیر دی تھی ــــ

وہ اداس ہو گئی۔

اتنا اداس کہ اگر اس کے پاس دوسرے لوگ نہ ہوتے تو شاید وہ پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگتی۔ پھر بھی اس نے آنکھوں سے آنسوؤں کی نمی پونچھی
اور سامنے دیکھنے لگی۔ ہر طرف ایک عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

یوں لگتا تھا۔

جیسے اس جگہ کسی جادوگر نے اپنا سحر پھونک کر بربادی پھیلا دی ہوں
ٹوٹے پھوٹے گھر اب بھی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اور رنگ و بو سے
ماضی کی یاد دلا رہے تھے۔ وہ ماضی جو کبھی حسین و پرکیف تھا۔

اور وہ

ماضی جو بے حد تکلیف دہ تھا۔ نواب ارجمند کی مہربانی سے اُسے کا ماضی
بھیانک اور داغ دار ہو گیا تھا اُسے وہ منظر یاد آیا۔ جب وہ اس گاؤں

سے نکلی تھی۔ اپنے بوڑھے بابا کے ساتھ۔ عجیب سی بے کسی اس کے چہرے پر چھا
گئی ——

وہ دیکھتی چلی گئی۔

وہ سامنے جو ٹوٹی ہوئی دیوار دکھائی پڑ رہی تھی۔ وہ شاید گاؤں کے چوہدری
کے مکان کی ہے۔ اچھا ہوا جو اس کا گھر بھی ڈھے گیا ——

کمبخت نے نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو اغوا کر کے نوابوں کو خوش کرنے
کی کوشش کی تھی۔ اس پیپل کے درخت کے پیچھے اس کی سہیلی فریدہ
کا گھر تھا۔ وہاں رحیم رہتے تھے۔ اور یہ نیم کا درخت تو پہلے بہت چھوٹا تھا۔
اب کتنا بڑا اور گھنا ہو گیا تھا۔ وقت کے طوفانی جھکڑوں کا جیسے اس
پر الٹا ہی اثر پڑا تھا۔ اور مزلہ دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی رہی۔ ایک ایک شے
کو پر اشتیاق نظروں سے۔ اس کے دل کی آواز یا بازگشت نے کہا۔

"کاش گاؤں کا عہد رفتہ پھر لوٹ آئے وہ لوگ وہ ایام پھر ایک بار پلٹ
آئیں تو وہ اپنی سہیلیوں کی صحبت میں اس نیم کی شاخ پر جھولا ڈال دے
گی۔ لانبی لانبی پینگیں چڑھاتے ہوئے وہ آکاش کی وسعت کو چھو لے گی۔
اور پھر گاؤں کے چھیلے نوجوان ادھر سے گذریں گے۔

اور تبھی

اس نے دیکھا گاؤں کا وہ عہد رفتہ پھر سے لوٹ آیا ہے ہرے بھرے



کھیت، کھلیان بڑے بڑے درخت ایک درخت کی شاخ پر جھولا ٹنگا ہے
سہیلیوں کے ساتھ وہ لمبی لمبی پینگیں چڑھا رہی ہے اس کا آنچل ہوا میں بادلوں
کی صورت اڑا اڑ کر آسمان کی بلندی کو چھو لینا چاہتا ہے۔ تبھی اس طرف سے کچھ
خوبرو نوجوان گذرے ہاتھوں میں کدال اور ڈنڈے لیے شاید وہ اپنے
کام پر نکلے تھے۔ ان میں بھولا بھی شامل تھا مزلہ کو دیکھتے ہی یکایک رک گیا
تھا۔

"ارے اتنی بڑی بڑی پینگیں مت مار ورنہ آسمان کو چھوئے گی اور
آسمان پر ہی رہ جائے گی۔"

بھولا نے زور سے کہا تھا۔

مزلہ شرما گئی۔ حیا کے بارے اس کی پلکیں جھک گئیں۔ پینگیں ڈھیلی ہو کر
سست ہو گئیں۔ اس کی سہیلیاں بھولا کی یہ بات سن کر کھلکھلا کر ہنس
پڑیں۔ لیکن مزلہ حیا کا مجسمہ بنی بھولا کی موجودگی میں کچھ نہیں کہہ پا رہی تھی۔ ورنہ
پینگ روک کر وہ ان چنچل سہیلیوں کی چوٹیاں پکڑ کر ایک ایک کو مزا
چکھاتی۔ اور جب جھولا رک گیا تو بھولا آگے بڑھ رہا تھا۔ مسکراتا ہوا ہنستا
ہوا، اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا۔ تبھی گاؤں کا چوہدری ادھر آ دھمکا۔
گھور کر

اس نے بھولا کو دیکھا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ بھولا اس سے اس

لیے ڈرتا تھا کیونکہ اُس کا باپ چوہدری کے گھر نوکر تھا۔ اس کی خوبصورتی سے زیادہ۔ اُس کی خوبصورتی سے بھی زیادہ۔ اگر وہ کسی سے پیار کرتا تھا تو وہ اس کی دولت —— اس کے بابا کے کھیت، زیور روپیہ جو اس نے تصویروں کے ذریعے کمایا ہے۔ اس کی سہیلیوں کا یہی کہنا تھا۔

بھولا جانتا تھا کہ مزلہ کی شادی میں اس کا بابا سب کچھ اسے دے دے گا۔ لیکن سہیلی کی باتوں پر مزلہ کو بالکل بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بھولا اسے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہے اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ تاہم اس کے دل میں اگر کبھی بھولا کی محبت پر شک گذرا ہوتا تو وہ اس سلسلے میں بھولا سے ضرور دریافت کرتی۔

"ماں! ——"

دفعتاً زاہد نے کہا۔ ماں کو اتنی دیر تک خیالوں میں کھویا دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔

"اوں —— آں —— ہاں؟ ——"

اچانک مزلہ جیسے بے ہوشی سے عالم ہوش میں آئی اور تب اسے احساس ہوا کہ ایک زمانہ بیت چکا ہے جیسے ایک چوتھائی صدی۔ بائیس سال۔ تقریباً بائیس سال اور وہ اس علاقے سے جا چکی ہے۔

جہاں اب واپس لوٹ کر جانا غیر ممکن تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا



حویلی شفق کی سرخ کرنوں میں اس طرح جھلک رہی ہے۔ جیسے یہ گاؤں کی معصوم دوشیزاؤں کے خون میں رنگ گئی ہو جس کے در و دیوار خون سے ہی سینچے گئے ہیں۔

اس کی پلکیں بے اختیار نم ہوگئیں —— جانے کیوں؟۔

"ماں! ——"

اس کے سامنے آکر زاہد نے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگی تھیں! ——"

"کچھ بھی نہیں بیٹے! —— کچھ بھی نہیں۔"

مزلہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"جہاں تیرے باپ کی زندگی بیتی ہے۔ وہاں آکر ماضی کی تصویر میں کھو گئی تھی ——"

زاہد کے دل کو چوٹ پہنچی۔ اسے اپنی ماں کے درد بھرے جذبات کا احساس تھا۔ اُس نے

اپنی ماں

کی کمر میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"خیمہ نصب ہو چکا ہے۔ سفر میں تھک گئی ہوں گی آئیں تھوڑی دیر آرام کرلیں ——"

"آرام کرنے کے لیے تو ساری رات پڑی ہے بیٹے! ــــ"

مزلہ نے خود پر قابو پا کر کہا۔

"کیوں نہ ہم اس حویلی کو چل کر دیکھ آئیں جو نواب ارجمند کی ہے۔"

"اس وقت! ــــ"

زاہد نے گھڑی دیکھی اور بڑھتے ہوئے اندھیرے کا اندازہ لگایا۔

"ہاں بیٹے! ــــ"

مزلہ پر امید لہجے میں بولی۔

"ابھی تو کافی روشنی ہے۔ ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔"

اپنے دل کی بے کلی پر قابو پانا مزلہ کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ زاہد نے ایک بار اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا نوکر چاکر فولڈنگ پلنگ لگا رہے تھے۔

سرونٹس

اور

دیگر کارکن لباس تبدیل کرنے کے بعد دور ہی سے حویلی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اس نے ٹارچ اٹھائی اور مزلہ کو لے کر حویلی کی طرف بڑھ گیا۔ اس خزاں رسیدہ درخت کے پاس پہنچ کر مزلہ کے قدم از خود ہی ٹھٹھک گئے اس کے کانوں نے محسوس کیا جیسے اس کی بہن سسک رہی ہے



اس کا باپ کوڑے کھا کھا کر بھی انصاف کی بھیک مانگ رہا ہے۔ زاہد آگے بڑھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے بھی اپنے سست پڑتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

لیکن اس کی بہن کی سسکیوں اور باپ کی درد انگیز پکار نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ حویلی کے قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا۔ باہر چہار دیواری کا پلاسٹر ایک جگہ سے ٹوٹ چکا ہے اور اندر کی اینٹیں مفلس کے جسم کی طرح جھانک رہی ہیں۔ گھاس میں منہ چھپائے کبڑے مکوڑوں کی رٹ نے ماحول کو اور بھی آسیبی بنا دیا تھا۔

لیکن نہ جانے وہ کونسی مقناطیسی طاقت تھی جس کے اثر سے زاہد اپنی ماں کے ساتھ اپنے آپ کو حویلی کی سمت کھینچتا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی خاموشی کے ساتھ خود بھی خاموش رہ کر جانے کیا سوچنے لگا تھا۔ چند ساعت کے لیے وہ گیٹ پر رکے گیٹ کا لوہا زنگ آلود ہو کر کھردرا ہو چکا تھا۔ زاہد نے اسے کھولتے ہوئے حویلی پر ایک نگاہ ڈالی۔

---

مکمل خاموشی مسلط تھی۔ ہر چپہ ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ گیٹ کھلنے کی آہٹ سے کیڑے مکوڑوں کی ٹرٹر اچانک ہی بند ہو گئی ـــــ ان کے قدم اندر رکھتے ہی لان کی بڑی جنگلی گھاس میں سرسراہٹ ہوئی شاید سانپ اور بچھو بھاگ رہے تھے۔

زاہد نے خطرے کا احساس کر کے لان کی گھاس پر ٹارچ کی روشنی پھیلا دی۔ لیکن مزنہ ہر خوف سے بے نیاز جیسے ایک ہی جست میں حویلی کے اندر داخل ہو جانا چاہتی تھی۔ راستہ کافی ناہموار تھا۔ لیکن وہ جلد ہی حویلی کے برآمدے میں پہنچ گئے۔

اچانک کچھ الّو اور چمگادڑ ان کے سروں کے اوپر سے پھڑپھڑاتے ہوئے



اُڑ گئے۔ ان کی ٹوؤہٹ۔ ٹودھو آواز سن کر زاہد کا دل کانپ گیا۔ لیکن مزنہ کے تو جیسے اعصاب ہی بند تھے۔ اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوئی وہ آج اپنی آنکھوں سے اپنی آہوں، اپنی سسکیوں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ رہی تھی۔ ایک ٹھوس اور زندہ حقیقت کے روپ میں۔ برآمدے کا فرش سنگ مرمر کا کا تھا۔ جس پر اب گرد کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ جس پر جانوروں کے قدموں کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ زاہد نے برآمدے کے کونے کی ایک سمت جونہی ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ دبکے ہوئے سیار اور گیدڑ بوکھلا کر گھبرائے پھر ان کے قریب سے بھاگتے ہوئے دوسری جانب غائب ہو گئے۔

زاہد کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

اس کا دل چاہا کہ لوٹ جائے اور چند ساتھیوں کو ساتھ لا کر حویلی کا اچھی طرح معائنہ کرے۔ مگر نہ جانے کونسی ایسی کشش تھی کہ اس کے قدم از خود آگے بڑھتے گئے اور وہ رکنا چاہتے ہوئے بھی نہ رک سکا۔

برآمدے کے مقابل کے بڑے دروازہ پر ایک بڑا سا قفل لٹک رہا تھا۔ برآمدے ہی میں کمرے سے ملحق زینہ تھا۔ مزنہ تیزی سے زینے کی جانب بڑھ گئی۔ زاہد اپنی ماں کی اس جسارت پر ششدر رہ گیا۔

پھر خود

بھی اُس کے پیچھے ہو لیا۔

ہر منزل پر ایک وسیع بالکونی تھی۔ جس کے درمیانی کمرے کے پہلو سے ہو کر اگلی منزل کے لیے سیڑھیاں ایستادہ تھیں۔ مزلہ بے خوف و خطر منزلیں طے کرتی گئی۔ ان کی آہٹ پا کر سیڑھیوں کے کونوں میں دبکے ہوئے اُلو اور چمگادڑ اُن کے سر اور شانوں کے اوپر سے ہو کر اڑ جاتے تھے۔

لیکن مزلہ اُن سب سے بے نیاز بڑھتی ہوئی سب سے بالائی منزل پہ پہنچی۔ کھلے کھلے آسمان میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اس کے چہرے کو چھو گئیں۔ آفتاب غروب ہونے کے بعد آسمان پر چھائی ہوئی سرخی غریبوں کے خون کی یاد دلا رہی تھی۔

مزلہ نے دور تک نگاہیں پھیلا دیں۔ اس مخصوص مقام پر کھڑے ہو کر جہاں کبھی اُس نے پہلی بار کریم نگر کا پورا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آج سب کچھ بدل چکا ہے۔ سب کچھ۔ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا صرف باقی ہے تو عہد ماضی کی ایک یاد! سامنے کھڑا وہ درخت سوکھ چکا ہے۔ اس کی بے برگ شاخوں پر بیٹھے ہوئے کوّے صاف نظر آرہے تھے۔ کچھ دوری پر جہاں خیمے لگے ہوئے تھے۔ وہاں نوکروں نے آگ جلا دی تھی۔



شاید وہ

لوگ کھانے پکا رہے تھے اُس نے حویلی کے پچھلے حصے پر نظر ڈالی۔ تاڑ کے لمبے لمبے درخت قریب دکھائی دے رہے دور تک آبادی کا نام و نشان ک نہ تھا۔ مویشی اور پرندے بھی نہیں۔ ایک کمزور عورت کی آہوں کا شکار ہو کر سب کچھ تحس نحس ہو چکا تھا۔

اُس نے تالاب میں جھانکا جس تالاب کے صاف شفاف اور عطر میں ڈوبے ہوئے پانی کو کبھی اُس نے مفلسوں کا خون تصور کر کے اپنے نتھنوں پر انگلیاں رکھ لی تھیں۔ آج وہ گندہ اور بدبودار ہونے کے باوجود صاف اور خوشبودار محسوس ہو رہا تھا۔

انسان کا دل بھی عجیب ہے۔ اپنے وہم و قیاس کی بنا پر اچھی چیزوں کو بُرا اور بُری چیزوں کو اچھا سمجھ لیتا ہے۔

گندہ تالاب اندھیرے میں مثل موت کے کنوئیں کے معلوم ہو رہا تھا اور کچھ کیچیلا پانی تھا۔ شاید یہ گذشتہ بارش کا پانی ہو۔

مینڈکوں کی ٹرٹر نے یہاں کے ماحول کو برساتی بنا دیا تھا۔ جب اس پانی کی تہہ میں کیڑے مکوڑے رینگنے لگتے تو سطح پہ ایک لہر سی اُبھر کر اندھیرے کی تہ میں ڈوب جاتی۔ زاہد نے پانی پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

لیکن یہ روشنی تالاب کے مہیب اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام

رہی۔ شاید تالاب کے کیڑے مکوڑوں کے لیے ٹارچ کی روشنی ایک بجلی کا اثر
رکھتی تھی جو پانی پر اس وقت تک پھیلی رہی جب تک زاہد نے ٹارچ روشن رکھی۔

زاہد اور
مزلہ اینٹ کی ریلنگ کے سہارے بالکل کنارے ہی پر کھڑے تھے
مزلہ تالاب کا گدلا پانی دیکھنے کے لیے تھوڑا اور جھکی ہی تھی کہ اچانک وہاں
سے ایک اینٹ سرک گئی، اڑتی ہوئی یہ اینٹ چھپاک کی آواز کے ساتھ تالاب
میں گری تو عقبی حصے میں چھپے بیٹھے جانور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

کیڑے مکوڑوں کا شور بلند ہو گیا۔

زاہد نے مزلہ کے بازو احتیاطاً پکڑ لیے مبادا پوری ریلنگ ہی زمین پر
آ رہتے وہ پیچھے ہٹے تو نیچے ایک گیدڑ بہت زور سے چیخا۔

لیکن اس چیخ کے ساتھ ہی اچانک ایک زور دار قہقہے کی آواز فضا میں گونجی۔

ہا ہا ہا ہا ........ ہا ہا ہا ہا ............ ہا ہا ہا ہا......

آواز حویلی کے اندرونی حصے سے آئی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کی درازوں میں
سے ہو کر باہر گونجی اور مزلہ اور زاہد کے کانوں سے ٹکرا کر کریم نگر کے ہیبتناک ماحول
میں مدغم ہو گئی۔

مزلہ خوف
سے کانپ کر زاہد کے سینے سے لپٹ گئی۔ دل زاہد کا بھی لرز اٹھا تھا۔ لیکن اس



نے خود پر قابو پاتے ہوئے ٹارچ کی روشنی حویلی کے اطراف میں پھیلا دی۔
اس نے چاہا کہ آواز کے میں جائے لیکن مزلہ نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

"نہیں بیٹے اے——"

اسے منع کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا——"

"ہاں اے——"

زاہد نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"ہاں بیٹے اے——"

مزلہ کی آواز اب گوں ہو گئی۔

"یہ کوئی زندہ آواز نہیں ہے۔ یہ تو کسی بھٹکی ہوئی روح کی آواز ہے——"

"ہاں اے——"

زاہد کو اپنی ماں کے عقیدے پر دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔

اس نے کہا،

"اس زمانے میں بھی تم ایسی باتیں کرتی ہو——"

"بیٹے اے——"

مزلہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر کر کہا۔

"یہ آواز تو میرے کانوں کا رس ہے۔ اس کی یہ لغزش تو میں بخوبی جانتی ہوں۔

یہ درد بھری چیخ - یہ پکار - اُف ! میرا دم کیوں نہیں نکل جاتا - میں مر کیوں نہیں گئی
میری زبان کیوں نہ جل گئی جس دن میرے ہونٹوں نے اس حویلی کو بد دعا دی تھی۔"

مزلہ

تڑپ

اُٹھی

"ماں ! ـــــ"

زاہد نے حیرت و استعجاب کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

"یہ سب کیا پہیلی ہے ؟ آخر کیا بات ہے جو تم اس قدر سنجیدہ ہو - اس حویلی کو بد دعا دینے سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟ کہیں ابا جی کی دوستی کا نا اٹھا کر نواب ارجمند نے تمہارے ساتھ کوئی ظلم تو نہیں کیا ـــــ"

"زاہد ! ـــــ"

مزلہ چیخ پڑی - زاہد پر ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے وہ رہ گئی۔

"مجھے معاف کر دو ماں ! ـــــ"

زاہد نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"نواب ارجمند کے ظلم کے بارے میں کون نہیں جانتا - اسی لیے ایسا کہہ دیا تم ہی نے تو بتایا تھا کہ میرے والد نواب ارجمند کے گہرے دوست تھے پھر میرے پیدا ہوتے ہی والد کے مر جانے کے بعد تمہیں بے سہارا دیکھ کر ا



نواب کا تمہاری جانب مائل ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہو گی - اگر ایسا نہیں تھا تو پھر تم نے اس حویلی کو بد دعا کیوں دی تھی ؟ ـــــ"

"یہ بات نہیں تھی بیٹے ! ـــــ"

مزلہ سنبھل کر بولی - مبادا اپنی بات بگڑ جائے اور اس کی ساری ریاضت پہ پانی پڑ جائے اس نے یہ بہانہ بنایا ـــــ

"تیرے ابا جی ! خود بھی ہوس کے بھوکے تھے - یہی وجہ ہے کہ عورت کی آہ اُن کے سینے میں نشتر بن کر ایسی چبھی کہ انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔"

"ماں ! ـــــ"

"ہاں بیٹے ! ـــــ"

مزلہ نے کہا۔

"اور چونکہ میری زندگی کی ساری خوشیاں اسی حویلی کے ہاتھوں لٹی تھیں اس لیے میں نے اپنی بیوگی سے گھبرا کر اسے بد دعا دے رہی تھی۔ برباد ہو جائے - مٹ جائے ـــــ" مزلہ نے حقیقت پر پردہ ڈال کر زاہد کو مطمئن کر دیا اور ساتھ ہی اپنے دل کو بھی - اگرچہ اس کا جواب ایک حقیقت پر مبنی تھا۔

---

زاہد خاموش رہا۔ سر جھکا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور سیڑھیاں اُترنے لگا۔ لیکن اپنے وہم کو دور کرنے کے لیے اُترتے وقت وہ ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر ضرور پھینکتا رہا۔ شاید کوئی دکھائی پڑ جائے۔
انسان نہیں
تو انسان کا سایہ ہی بھوت پریت پر اعتبار ...... کرنے کا اس کے نزدیک کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے کوئی انسانی شکل یا سایہ نظر نہیں آیا۔ ہاں اگر مزلہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ ضرور اس آواز کا تعاقب کرتا۔

ممکن تھا کہ کہیں کوئی نشان مل جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں ایسے اقدام اٹھا کر وہ مزلہ کے دل کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم وہ ایک



لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ اگر ماں کے اعتقاد کے مطابق یہ آواز اُس کے والد کی تھی۔ تو ممکن ہے یہ ایک روح ہی ہو۔ لیکن اس کے والد کو تو گزرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔

ہو سکتا ہے۔ یہ آواز اس کے والد کی نہ ہو۔ بلکہ کسی اور ہی کی ہو۔ شاید کوئی پاگل یا دیوانہ ہی یہاں آوارہ پھر رہا ہو جس کے گھر کی سب لڑکیاں نواب ارجمند کی ہوس کی شکار ہو چکی ہوں۔ ہاں شاید یہی بات ہو گی۔
ماں کو
بے کار ہی اس آواز پر اس کے والد کا دھوکہ ہو رہا ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو بھلا ماں کا ساتھ کیوں چھوڑتے؟ ماں تو دکھ کی ماری ہے اور دکھوں بھرا دل قدرتاً جذباتی ہوتا ہے۔ ان کا دل ہمیشہ وہی بات سوچے گا جس سے انہیں سکون کی امید ہو گی۔

زینہ طے کرتے ہوئے اس کی ٹارچ کی روشنی میں پرندوں کی آنکھیں کچھ اس تیزی سے چمک رہی تھیں جیسے کونوں میں دبکے پرندے نہیں بڑے بڑے بلے بیٹھے ہوں۔ اس وقفے میں جانور پھر برآمدے میں واپس آ گئے تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ پاتے ہی وہ پھر بھاگ کھڑے ہوئے کیمپ لوٹتے وقت مزلہ نے ایک بار پھر حویلی کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ جو اس کی اُجڑی ہوئی یادوں کی قبر تھی۔ محبت کا مقبرہ اور پیار کا مزار تھا ۔۔۔ اس کی آنکھوں سے

آنسوؤں کی آبشار بہہ نکلا۔

رات کے

تقریباً دو بجے تھے کیمپ کے اندر پلنگ پر لیٹے لیٹے مزلہ نے کئی بار آنکھیں بند کرکے سو جانے کی کوشش کی لیکن نیند تو جیسے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ ایک پل بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ ذہن سوالوں کے تانتوں سے اُلجھتا جا رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟ کیا حقیقت میں ایک مظلوم عورت کی آہوں میں اس قدر طاقت ہوتی ہے۔ اتنے بڑے نواب کی بربادی اتنے تھوڑے عرصے میں اس طرح تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلو کے بستر پر زاہد سو رہا تھا۔ بالکل بے خبر۔ بے فکری کی نیند۔ اپنی ماں کے دل میں اُٹھتے ہوئے خیالات کے طوفان سے بہت دور۔ پلنگ سے اُٹھ کر اُس نے کئی بار سوتے میں اسے دیکھا تھا۔ بہت غور سے بہت پیار سے۔ جیسے زندگی میں اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اس نے اُس کی پیشانی بھی چوم لی تھی۔

ہو بہو وہی نقشہ اپنے باپ نواب ارجمند کی تصویر ا ـــــ

دفعتاً کیمپ کے باہر اُس نے قدموں کی چاپ سنی۔ اس نے کروٹ بدل کر ادھر اُدھر دیکھا۔ زاہد بدستور غفلت کی نیند سو رہا تھا۔ اس نے



محسوس کیا قدموں کی چاپ اس کے خیمے کی طرف ہی بڑھ رہی ہے۔ سوکھے پتے قدموں تلے چرچرا اٹھتے تھے۔

ایک انجانے

خوف کے اثر سے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ چاپ خیمے کے نزدیک تر آئی تو مزلہ اُٹھ کر خیمے کی جھلملی کے پاس چلی آئی۔ بہت آہستہ سے ـــ دبے قدموں کے ساتھ۔ پھر قدرے جھک کر اُس نے جھلملی کا پردہ کچھ اوپر اٹھایا دور باہر جھانکا۔

باہر گہرا اندھیرا تھا۔ لیکن معاً وہ چونک گئی۔ اس نے اندھیرے کی چادر کو چیر کر ایک سایہ آگے بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اُس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ دراز قد سایہ لیکن کچھ جھکا جھکا سا ـــ اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ کہ یہ ایک حقیقت ہے ـــ یا نواب۔ ایک ہی نظر میں وہ اس سائے کو پہچان گئی۔

تو اس کے لیے ہونٹوں کو قابو میں رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اور اس کی چیخ نکل گئی۔

"نہیں ا ـــ"

اس کی آواز سن کر زاہد جاگ اٹھا۔ آس پاس کے خیموں میں شور مچ گیا۔ زاہد لپک کر مزلہ کے قریب پہنچا۔ مزلہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

جھلملی کا پردہ بدستور ہاتھوں میں اُٹھا ہوا تھا۔ اور مزلہ کی آنکھیں باہر اندھیرے میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"ماں ۔۔۔"

زاہد نے جھک کر مزلہ کے بازو تھام بے حیرت سے ایک بار باہر جھانکا پھر اس کے پریشان چہرے کی جانب دیکھا۔

"کیا بات ہے ماں ۔۔۔ کیا بات ہے؟ ۔۔۔"

"بیٹا وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مزلہ نے فوراً لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"وہ آئے تھے ۔۔۔"

"کون ماں؟ ۔۔۔ وہ کون؟ ۔۔۔"

زاہد نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اس طرح جھنجھوڑا کہ اس کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا اور جھلملی بند ہو گئی۔

"نواب ارجمند خاں ۔۔۔"

مزلہ کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"نواب ارجمند خاں ۔۔۔"

زاہد کو زاہد نہیں ہو سکا۔

"ہاں بیٹا ۔۔۔ یہ اُن ہی کی روح تھی ۔۔۔"



"ماں ۔۔۔"

زاہد کو اپنی ماں کی حالت پر ترس آیا۔ اسے تسلی دیتے ہوئے اُس نے کہا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ یقیناً تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"او ماں! آج کل تمہیں کیا ہو رہا ہے۔"

زاہد نے اُسے پلنگ پر بٹھا کر پیار سے کہا۔

"بھلا نواب ارجمند کی روح تمہارے پاس کیوں آنے لگی؟ ۔۔۔"

مزلہ اس سوال پر چونک پڑی۔ سچائی کا انکشاف کر دینے سے زاہد کے مستقبل پر پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ جو پُرشکوہ خاندان میں رشتہ ہو رہا ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ وہ کشمکش میں پڑ گئی۔

تبھی خیمے کے داخلی دروازے پر چند نوکر جمع ہو گئے۔

"کیا بات ہے صاحب؟ ۔۔۔"

ان میں سے ایک شخص پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔" زاہد نے جواب دیا ۔۔۔ "ماں کوئی بھیانک خواب دیکھ کر ڈر گئیں تھیں۔"

مزلہ نے

کچھ ایسی مایوس نگاہوں سے جس سے ظاہر تھا کہ اس کی بات کا یقین نہ کر کے زاہد نے اس کی توہین کی ہے۔ زاہد نے ماں کے اس ردِعمل کو بری طرح محسوس کیا وہ دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوا۔ پھر خود ہی اونچی آواز سے پوچھا۔

"کسی آدمی کو تو میرے خیمے کے باہر نہیں دیکھا میرا مطلب کسی باہری آدمی کو؟——"

"ادھر تو کوئی نہیں ہے——"

باہر سے ایک نوکر نے حیرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

"یہاں دن میں تو کوئی آتا نہیں اس وقت کیا آئے گا؟——"

زاہد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے مزلہ کی جانب دیکھا۔ جو اس وقت میں سنبھل چکی تھی۔

نواب ارجمند کے لیے اُس کے دل میں اُٹھتا ہوا عارضی پیار کا جذبہ یکایک نفرت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اپنی ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر اُس نے کہا۔

"میرا خیال ہے نواب ارجمند خاں کی روح ہم سے انتقام لینا چاہتی ہے۔"

"کیا کہتی ہو اماں!——"

زاہد نے نیند کے جھونکے میں کھسیانا ہو کر کہا۔



"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا!——"

مزلہ نے اعتقاد کے ساتھ کہا۔

"میری آہیں اس حویلی کو کھا گئی ہیں۔ اس لیے اب ان کی بھٹکتی ہوئی روح ہماری خوشیاں بھی چھین لینا چاہتی ہے——"

"اگر ان کی روح کو تمہاری خوشیاں چھین لینا ہی درکار تھا تو وہ یہاں کیوں آتی وہ لاہور میں ہمارے گھر آکر بھی تو میرا گلا گھونٹ سکتی تھی؟——"

"نہیں بیٹے! ایسی بات نہیں ہے——"

مزلہ نے اسے جیسے پتے کی بات سمجھائی۔

"جہاں انسان دم توڑتا ہے۔ روح بھی وہیں آس پاس بھٹکتی رہتی ہے دور نہیں جا سکتی۔"

"کیوں نہیں جا سکتی؟ آخر اس کے لیے ممانعت ہی کیا ہے——"

زاہد اس بحث سے اکتا چکا تھا۔

مزلہ لاجواب ہو گئی

مگر یہ خیال اس کے ذہن پر حاوی ہو چکا تھا کہ جب اس کی بددعاؤں کے اثر سے نواب ارجمند خاں کی حویلی اس حیرت انگیز حالت کو پہنچ چکی ہے۔ اس کا خاندان تباہ و برباد ہو چکا ہے اور نواب ارجمند کا وجود بھی نفرت کی آگ سے جل کر راکھ ہو چکا ہے تو پھر بھلا اُن کی روح اُسے کیوں چین

سے بیٹھنے دے گی؟

یقیناً اُن

کی روح زاہد اور اُس کا گلا دبانے ہی آئی ہو گی۔ یہی ایک وجہ تھی کہ جس

میں ایک بار محبت اور ہمدردی کا جذبہ اُبھرا تھا وہاں پھر نفرت پیدا ہو گی۔

"اب تم سو جاؤ ماں ! ــــــ"

زاہد نے اپنا پلنگ مزلہ کے پلنگ کے اور قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ لالٹین

کی لو اُس نے کچھ اور تیز کر دی تاکہ ماں کا دل نہ گھبرائے۔ پھر بولا۔

"کل صبح ہی میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔ ورنہ یہاں رہ کر اپنی بیتی ہوئی باتوں

کو یاد کر کے تم پاگل ہو جاؤ گی پھر میرا کیا ہو گا۔"

مزلہ کا دل کھل اٹھا۔ چہرے پر سنجیدگی کی جگہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیٹتے ہوئے

اُس نے سوچا اس کا بیٹا اُسے کتنا چاہتا ہے یہاں سے واپس جانے کے

وہ اُسے ہرگز یہاں نہیں آنے دے گی یہاں وہ روح ہمیشہ اُس کے

کا تعاقب کرتی رہے گی۔

یقیناً نواب ارجمند کی روح اس سے اپنی بربادی کا انتقام لینے آئی

اور دوسرے پلنگ پر لیٹا زاہد سوچ رہا تھا۔

کہ ماں

کو پہنچانے اور واپس آنے میں اس کے دو دن اور خراب ہو جائیں گے



دیگر تمام لوگوں کو انتظار کرنا پڑے گا۔ وقت الگ ضائع ہو گا۔ اور پریشانی بھی بڑھے

گی۔ عورت [illegible] ہے ماں ہو۔ بیٹی ہو۔ بہن ہو یا بیوی ہو مرد کی ترقی میں باعث

مزاحمت [illegible] ہے۔

دوسری صبح زاہد کے معاون نے انہیں جیپ سے ملتان سٹیشن پہنچا دیا

تو وہ پہلی ٹرین سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ زاہد نے سوچا ماں کا واپس

جانا اچھا ہی ہے اُسے شاہدہ کے ساتھ جلد سے جلد شادی کر لینے کی جلدی

تھی۔

مزلہ نے بہت چاہا کہ زاہد لاہور میں رک جائے لیکن اس کے لیے یہ غیر

ممکن تھا کیونکہ اتنی بڑی ذمہ داری کا کام سر لینے کے بعد اس سے دست بردار

ہو جانا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہت مشکل سے اس

نے مزلہ کو راضی کیا۔

اس شرط پر کہ رات میں وہ ملتان کے ایک بڑے ہوٹل میں رہیں گے اور

صبح سے سورج غروب ہونے تک کریم نگر میں رنگ محل میں وہ قدم بھی نہیں

رکھے گا۔ زاہد نے خوشی کے ساتھ مزلہ سے یہ وعدہ لے لیا کہ پہلی ہی فرصت

میں وہ شاہدہ کے گھر جائے گی۔

مزلہ کی ٹیکسی ایک وسیع اور خوبصورت بنگلے کے بیرونی گیٹ پر رکی

ٹیکسی سے اترتے ہوئے اُس نے گیٹ پہ آویزاں پلیٹ کی تحریر کو پڑھا

نکھا نکھا خان اشرف خان ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دیتے ہوئے اُس نے اپنی اندر
کی ساڑھی کو درست کیا اور بنگلے کے لان میں داخل ہو گئی۔ پورٹیکو کے نیچے شاہد
کی کار کھڑی تھی سفید اور لمبی چوڑی غیر ملکی کار اس نے ابھی برآمدے میں قدم
رکھا ہی تھا۔

کہ ایک

نوکر اسے دیکھ کر آگے بڑھ آیا۔

"اشرف خان ہیں ؟" مزلہ نے پوچھا۔

"جی ہاں !"

"ان سے کہہ دو کہ زاہد کی ماں آئی ہیں !"

"آئیے بیٹھئے !"

نوکر اسے باعزت اندر لے گیا اور صوفے پر بٹھا کر اندر چلا گیا۔
خوش سلیقگی سے آراستہ کمرے کو دیکھ کر مزلہ کھو سی گئی اس کی نگاہ ایک
تصویر پڑی جو ایک موٹے فریم میں سامنے دیوار پر آویزاں تھی۔ اس کی نظریں
تصویر پر منجمد ہو کر رہ گئیں۔

اس تصویر میں ایک کشتی طوفان میں گھری دکھائی گئی تھی۔ جس کے پتوار
ٹوٹ گئے تھے پھر بھی مانجھی نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ اس تصویر
کو وہ کس طرح بھول سکتی تھی ؟ اس تصویر سے تو اس کی اس زندگی کی ڈور



وابستہ تھی۔

اسی تصویر کے تاثر سے تو میں صحیح معنوں میں جینے اور زندگی کی راہ میں آنے
والی مشکلات کا ہمت اور دلیری سے مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن یہ
سوچ کر وہ ششدر سی رہ گئی کہ یہ تصویر یہاں کیسے آئی۔

یہ تصویر

تو اُس نے نواب ارجمند کے محل میں دیکھی تھی اور نہ ! یہ بھی کوئی سوچنے کی
بات ہے ؟۔ دنیا میں ایسی تصویریں تو لاکھوں کی تعداد میں ہونگی پھر اس کا
یہاں ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بڑے لوگوں میں تو یہ شوق عام ہیں۔

وہ اپنی نظریں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اخروٹ کی قیمتی لکڑی کے فرنیچر۔ ریڈیوگرام۔ پیانو۔ دیواروں پر دوسری
تصویریں بھی تھیں معاً دوسرے کمرے سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص اس کمرے
میں داخل ہوا پیچھے پیچھے ایک محترمہ بھی تھیں مزلہ کو سمجھنے دیر نہیں لگی کہ یہی
شاہدہ کے والدین ہیں۔ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور سلام کیا انھوں
نے مسکراہٹوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

"بیٹھئے ! بیٹھئے"

شاہدہ کی ممّی نے کہا۔ اور اپنی ریشمی ساڑھی کو سمیٹتے ہوئے وہ بھی
اپنے شوہر کے پہلو میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ مزلہ نے بیٹھتے ہوئے غور کیا۔

رنگ و روپ میں وہ بالکل شاہدہ سے مشابہہ ہے۔ اگر عمر درمیان میں حائل نہ ہوتی تو دونوں کو الگ الگ پہچاننا مشکل ہوتا ——

---



اچانک اس کے دل میں خیال گذرا شاید اُس نے ان محترمہ کو بھی کہیں دیکھا کہاں؟ کب؟ —— وہ یاد نہیں کر سکی۔ شاید اسی لیے شاہدہ کو دیکھنے کے بھی وہ یہی سوچ بیٹھی تھی۔

"میں زاہد کی ماں ہوں ——" اُس نے گفتگو کا موضوع چھیڑا۔

"جی ہاں! نوکر نے ابھی ابھی بتایا تھا ——"

اشرف خاں نے کہا۔

"آپ کے لڑکے کے متعلق شاہدہ ہمیں پہلے بھی بتا چکی ہے۔ اور کل رات ہم باہر سے واپس آئے تب بھی وہ اس کی تعریف کرنے لگی۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ آج آپ ضرور آئیں گی ——"

یہاں وقت

پر پہنچنے کے لیے مزلہ نے اُس حادثے کو ایک اچھا شگون سمجھا جس کے سبب اُسے لاہور واپس آنا پڑا تھا۔ اگر آج وہ یہاں نہ پہنچتی تو بُرا ہوتا کیونکہ وہ اس کے منتظر رہتے۔ زاہد نے شاہدہ سے کہا ہوگا کہ وہ اپنی ماں کو آج کے دن اُس کے گھر بھیجے گا۔ وہ احسان مندی کے لہجے میں بولی۔

"آپ کی لڑکی بہت مہذب ہے۔ خدا کی مہربانی ہے کہ زاہد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ ان دونوں کا رشتہ جلد ہی کر دیا جائے ——"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ کیوں نہیں ——"

اشرف خاں صاحب نے جیب سے سگار نکالا اور ہونٹوں سے لگانے سے قبل بولے۔

"شاہدہ سے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ زاہد کے والد بچپن ہی میں گزر گئے۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے تو ہماری خوب نبھتی ——"

اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

مزلہ کے

چہرے پر سنجیدگی کی بجائے پریشانی کی علامتیں نمایاں ہو گئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اشرف خاں اُس کے شوہر کے متعلق چھان بین شروع کر دیں

رشتہ وابستہ



کرنے سے پیشتر بڑے لوگ حسب و نسب تو ضرور ہی دیکھتے ہیں۔

مزلہ کی پریشانی اشرف خاں سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور جب صبر نہ ہو سکا تو اُنہوں نے پوچھ لینا ہی مناسب سمجھا نہ جانے اس پریشانی میں کیا راز ہو؟ ——

"مزلہ بی بی! ——"

انہوں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بھری جوانی میں زاہد کے والد کی موت کا کیا سبب تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی حادثہ۔ بیماری یا ...... اور کوئی وجہ؟ ——"

مزلہ کے چہرے پر مزید پریشانی بڑھ گئی۔ وہ ان سے آنکھیں ملانے کی جسارت بھی نہ کر پا رہی تھی دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔

اشرف خاں کا وہم یقین میں بدلنے لگا۔ انہوں نے کہا۔

"دیکھیے مزلہ بی بی شادی سے پہلے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ زاہد کے والدین کون تھے؟

"کیا کرتے تھے۔ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ تبھی ہم اپنی لڑکی کا رشتہ آپ کے لڑکے کے ساتھ وابستہ کر سکتے ہیں! ——"

"ہاں بہن! ——"

شاہدہ کی ممی بھی مزلہ کی گھبراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ بولیں۔

احساس ہو رہا تھا۔ نظریں جھکائے وہ باہر نکل گئی۔ برآمدے میں اُسے شاہدہ
ملی کوئی لڑکی اسے اپنی کار میں چھوڑ کر جا رہی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

شاہدہ اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔ چاہا کہ بڑھ کر اُس کے قدم چھوئے۔ لیکن
آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ دل دھڑک اٹھا۔ مزلہ سے
اس نے کچھ دریافت کرنا چاہا۔ لیکن جواب پہلے ہی سسکیوں میں مل گیا۔

مزلہ اس کے سامنے سے ہو کر برآمدے کی سیڑھیاں اُترتی ہوئی باہر گیٹ
کی جانب چل دی۔ شاہدہ اس طرح ساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جیسے اس کی آنکھوں
کے سامنے اس کے ارمانوں کا جنازہ جا رہا ہو۔ یہ سب کیا ہو گیا؟ کیا ہو گیا؟

اچانک ہی؟

وہ تو اپنے گھر والوں کو پہلے ہی رضامند کر چکی تھی۔ پھر بات کیسے بگڑ گئی؟
اس کے والدین کو اپنی بیٹی کے لیے صرف ایک لائق اور ہونہار شوہر ہی تو چاہیے
تھا۔ دولت تو اس کے گھر میں پشتوں تک کے لیے کافی ہے۔ شانے
جھٹک کر وہ تیز قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔

اس کے والدین اس کے منتظر تھے ــــــ

کریم نگر واپس آ کر زاہد نے دوسرے ہی دن سے سروے کا کام شروع کیا۔
کریم نگر کے چپے چپے کا اس نے بغور معائنہ کیا۔ ناہموار زمین بے ترتیب



"میں صرف زاہد کے رشتے کے لیے آئی ہوں۔ اس کے باپ کے رشتے کے لیے نہیں"

"مزلہ بی بی! ــــــ"

اشرف خاں چیختے چیختے رہ گئے۔ سگار لبوں تک آتے آتے اُنگلیوں کی گرفت
سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔"

مزلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے! ــــــ"

"پھر شاہدہ بھی ہماری نجی لڑکی ہے ــــــ" اور رشتہ بھی ہماری پسند
اور تسلی سے ہوگا۔

شاہدہ کی ممی بھی طیش میں آکر اٹھ کھڑی ہوتی بولی۔

"اپنی پیاری بیٹی کے لیے اس خاندان کے متعلق ہمیں معلومات حاصل کرنے کا
پورا پورا حق ہے۔ جس گھر میں ہماری بیٹی بہو بن کر جائے گی۔ آپ جا سکتی ہیں۔
ہمیں نہیں معلوم تھا کہ زاہد ایک ایسی ماں کی اولاد ہے جس کے شوہر کا کوئی
پتہ نہیں۔"

مزلہ کوئی

جواب نہیں دے سکی۔ دل میں ایک تڑپ سی اٹھی۔ اپنی بدنصیبی کے ساتھ
وہ اپنی اولاد کی بدبختی بھی لے کر پیدا ہوئی تھی۔ جس کا اسے آج شدت کے

"تمہیں اپنے زاہد کی قسم اس رشتے کے سلسلے میں ہم سے یہ بات پوشیدہ رکھ کر
ہمیں ہرگز دھوکہ مت دینا ———"

مزلہ نے

چاہا کہ وہ جھلا کر کہہ دے کہ زاہد کی رگوں میں وہ خون ہے جس کی تمنا میں لوگوں
ہزار بار جنم لینا پڑتا ہے۔ نوابی خاندان کا خون ہے ——— اس کی رگوں میں
لیکن اس کی گویائی جیسے چھن گئی۔ اس نے سوچا ایسا کہہ دینے سے ان کی نظروں
میں اس کے کردار کی کیا وقعت رہ جائے گی؟ یہ لوگ کیوں کر اعتبار کریں گے۔
کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ ہے؟۔

بہ فرض محال یہ سچ بھی ہو تو اس کا ان پر کیا اثر پڑے گا۔ نوابوں کی اولادیں
تو سینکڑوں خوبصورت لڑکیوں کے ذریعے جنم لیتی ہیں اور پھر سچ بات کہہ
دینے سے تو یہ بات زاہد تک بھی پہنچ جائے گی۔ اور اس طرح سب کچھ برباد
ہو جائے گا۔ لٹ جائے گا۔ وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں گر جائے گی۔ اس کا بیٹا
اس حقیقت کے غم کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ زبان کھول دینے سے سچ مچ
پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ اس پر اور اس کے بیٹے پر بھی۔ زندگی بھر کی اس کی ریاضت
رائیگاں ہو جاتی۔ اس نے اپنے لبوں کو سی لیا۔

آنسوؤں کو

پی کر دل پر پتھر رکھ لیا۔ اور بولی۔



کہیں

اونچی

کہیں بہت نیچی۔ بے ڈھنگے ٹیلے۔ تو کہیں تالاب کی گہرائی لیے ہوئے خشک
گڑھے کہاں سے سڑک نکلنی چاہیے۔ کہاں چھوٹے چھوٹے پل بنا دیے جائیں
تاکہ سڑک پر پانی نہ چڑھ سکے سب ضروری باتیں اس نے نوٹ کر لیں۔

یہ خطہ خوبصورت رہائشی مکانات کے لیے مناسب رہے گا۔ آبادی سے
دور وہ جگہ فیکٹریوں کے لیے مخصوص کر دی جائے۔ اس خطے میں زراعت اچھی
ہوگی۔ ادھر وہ جگہ محکمہ تعلیم کے لیے موزوں ہوگی۔ یہاں پارک، کھیل کے میدان
وغیرہ ریلوے اسٹیشن، فیکٹریوں کے نزدیک ہونا چاہیے تمام ضروری مقامات
کو اس نے ایک نکتہ شناس نظر سے دیکھا اور پرکھا پھر کمال احتیاط سے
ان سے متعلق اپنے نقشے میں ان کے مخصوص نشان بنا دیئے۔

اپنے اس تعمیری منصوبے کے ماتحت اور کمپنی کی ہدایت کا احترام کرتے ہوئے
اس نے حویلی کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد اس نے جلد ہی اس نقشے کو کمپنی کے
سپرد کر دیا۔ تاکہ حکومت سے تنخواہ حاصل کی جا سکے۔ پھر اس امید کو لیے کہ ماں نے
اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی ہوں گی۔

وہ

خوشی

خوشی گھر پہنچا۔ اسے اطمینان تھا کہ شاہدہ کی طرف سے رشتہ نامنظور کر دینے کا کوئی امکان ہی نہیں۔

لیکن جونہی اس نے گھر میں قدم رکھا مزلہ اُسے دیکھ کر زار و قطار رونے لگی زاہد کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ماں کو سنبھالتے ہوئے اُس نے سوٹ کیس نیچے رکھا اور ماں کو صوفے پر بیٹھا دیا۔ مزلہ کے لیے اب اپنی حقیقت کا اظہار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ جانتی تھی کہ زاہد شاہدہ کے گھر والوں کے انکار کرنے کا سبب دریافت کرے گا۔ اگر وہ اس حقیقت سے پردہ پوشی بھی کر جائیں تو زاہد شاہدہ سے ضرور ملاقات کرے گا۔ اور تب یہ راز نکل جائے گا کہ اشرف خاں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دینے سے کیوں انکار کر دیا ہے۔ بات طول پکڑ جائے گی۔ اس لیے اُس نے مناسب یہی سمجھا کہ خدا پر بھروسہ کر کے وہ خود ہی کیوں نہ اپنی زندگی کی مجبوریوں اور لاچاریوں کو زاہد پر ظاہر کر دے اور اسی لیے جب زاہد نے اس سے انکار کی وجہ دریافت کی تو وہ اس سے کچھ پوشیدہ نہیں کر سکی۔

اس نے

اسے اپنی زندگی کی تمام روداد سنا دی۔ وہ تمام حالات جن سے ہو کر اُسے گذرنا پڑا تھا۔ ان میں اس کی معصوم چھوٹی بہن۔ اس کا باپ



اور وہ خود بھی شامل تھی۔

اس نے اُسے کیسے کہاں اور کن ناسازگار حالات میں جنم دیا ——

اس نے سب بتا دیا۔

---

پھر وہ بولی۔

"بیٹے اگر فادر جوزف میری مدد کو نہ آتے تو میں تجھے یتیم خانے کو سونپ کر خودکشی کر لیتی۔ تیری پیدائش سے قبل اس لیے خودکشی نہیں کر سکی کہ تیری موت کا گناہ اپنے سر نہیں لے سکتی تھی۔ اگر فادر جوزف ہمیں پناہ نہ دیتے۔

تو ہمارا

جینا محال ہو جاتا۔ اُن ہی کی مہربانی سے تو آج اپنے پاؤں پر کھڑا ہے بچپن ہی سے اُنھوں نے تیری تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا تھا۔ کالج وغیرہ میں تجھے وظیفہ اسی لیے مہیا ہوتا رہا تھا کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ ہم پر اُن کی خاص نظر عنایت ہے۔

اب تو ہی بتا تیری قسم کا واسطہ ملنے کے بعد میں کس اشرف خاں کو اپنی



یقت بتا دیتی؟ کیا ہم ان کی نظروں میں ذلیل نہ ہو جاتے۔ شاہدہ بھی تجھ سے رت کرنے لگتی۔ کون یقین کرے گا۔ کہ تیری رگوں میں نوابی خون ہے اور اگر ل یقین کر بھی لیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ — ایسی تو ہزاروں اولادیں وابوں کی عیاشیوں کا نتیجہ ہیں۔

اس راز

کو میں تجھ سے اب تک اسی لیے پوشیدہ رکھے رہی مبادا تو مجھ سے نفرت رنے لگے ایک ماں ہوں۔ کیسے برداشت کر لیتی کہ جسے اپنی چھاتی سے دودھ ی جگہ خون پلا پلا کر پالا ہے وہی مجھے نفرت کی نظر سے دیکھے۔

مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں اپنی حقیقت کا علم ہونے کے بعد تو دنیا کو منہ دکھانے ی بجائے خودکشی نہ کر لے لیکن بیٹے! میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ میرا نصیب ی اس طرح پھوٹا تھا تو میں کیا کرتی کریم نگر میں جنم لینے والی ہر دوشیزہ کا یہی حال ہوا ہوگا جو آج میرا ہے۔"

مزلہ سسک سسک کر رو پڑی۔

"نہیں ماں! — تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں! —"

زاہد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اطمینان دلایا اور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"تم فرشتہ ہو۔ مجسم فرشتہ! — آج تک تم میرے لیے زندہ تھیں اب

میں تمہارے بیٹے زندہ رہوں گا ـــــ" میں بھول جاؤں گا کہ شاہدہ نام کی کوئی
لڑکی میری زندگی میں کبھی آئی تھی۔ کاش اے ـــــ"

زاہد

نے

اس گھڑی کو بُرا کہا۔ جب شاہدہ سے اُس کی آخری ملاقات ہوئی تھی مگر غیر
ایک لڑکی ہو کر جب شاہدہ اُس حادثے کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی ہے۔
تو پھر وہ کیوں اس کے لیے فکر مند ہو؟

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"و تم بھی بھول جاؤ ماں اے ـــــ کہ تم نے شاہدہ کو بہو بنانے کا خواب دیکھا
تھا۔ بہت سے خواب کبھی تعبیر آشنا نہیں ہوتے اے ـــــ"

زاہد کی باتوں سے مزلہ کو یک گونا اطمینان بھی ملا اور چوٹ بھی پہنچی۔ اطمینان
اس وجہ سے کیونکہ زاہد نے اس کی مجبوری کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیا
تھا۔ چوٹ اس لیے پہنچی کہ اپنی بدنصیبی کے شکنجے میں پھنس کر وہ اپنے بیٹے کی
مسرتوں کی تکمیل نہیں کر سکی۔ شاہدہ اس کی شریک زندگی نہ بن سکی۔

اپنے

بیٹے

کے دلی کرب کا اندازہ کر کے اس کا دل تڑپ اٹھا لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی



ائے کٹھ پتلی کی صورت نچا رہی تھی۔ اس نے نواب ارجمند کو نفرت سے کوسا۔
ان کی روح ہمیشہ بھٹکتی رہے گی۔ مر کر بھی کمبخت اپنے ظلم کا بوجھ سدا کے لیے
ن پر ڈال گیا ہے۔

رے کام تو بیٹے اے ـــــ"

ہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اللہ ایک روز سب کچھ ٹھیک کر دیں گے۔"

"اللہ اے ـــــ"

زاہد نے سخت لہجے میں کہا۔ چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری آنکھیں آگوں
ہ اس نے اپنی نظریں دوسری جانب پھیر لیں جہاں کھڑکی کے باہر درخت
ی شاخ پر ایک گھونسلا تھا۔

اس

نے

وچا اب خدا بھی کیا کر سکتا ہے؟ نواب ارجمند اگر حیات ہوتے تو اپنے حق کو
ارنے کے لیے ایک بار تو ضرور سعی کرتے۔ جب جڑ ہی کٹ گئی تو درخت
ر ہرے پتے کی اُمید کیسی، سب امیدیں بیکار ہیں ـــــ فضول ہے سب
ـــــ"

ئی دن گذر گئے۔

کریم نگر

کی

سڑک پر ایک بڑا سا جوڑا ایستادہ تھا۔ جس پر جلی حروف میں لکھا
تھا۔ احمد نگر کی جائے تعمیر۔ حکومت نے اس کا کیا نام احمد نگر رکھ کر اس کی تعمیر
کا ٹھیکہ دیا تھا۔ حکومت نے زاہد کے مرتب کئے ہوئے نقشے کو سراہتے ہوئے منظور
کی تھی۔ اور تجویز شدہ پوری رقم کی ادائیگی بھی منظور کر لی تھی۔

کریم نگر میں کام جاری تھا۔ جائے تعمیر کو رقبوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ جہاں دن
رات لڑکوں کے ذریعے اینٹیں اور پتھر اور چونا۔ سیمنٹ کے بورے لوہے
کی چھڑیں۔ گارڈر اور دیگر تعمیری سامان مسلسل چلے آ رہے تھے۔

جگہ

جگہ

خیمے نصب تھے مزدوروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مزدوروں
کے ڈیرے ایک علیحدہ مقام پر تھے صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد مزدور
کی ندی میں نہا دھو کر کھلے میدان میں چولہا جلا کر کھانا پکانے میں مشغول ہو جاتے۔
نئے کھودے ہوئے کنوئیں کا پانی افسران کے استعمال میں آتا تھا۔ افسران
میں یہاں سبھی تھے۔ آرکیٹیکٹ، انجینئر، بے حساب دیگر کارکن۔ رات کے
کھانے سے فرصت پانے کے بعد فرصت میں چند افسران ایک جگہ جمع ہو کر



یں لگ جاتے تھے۔ محنت کش لوگ جلد ہی آرام کرنے لیٹ جاتے تھے۔

تقریباً

ب

کارکنوں نے یہاں آنے کے بعد پہلے یا دوسرے دن ہی حویلی کو پوری طرح
تھا۔ اس سلسلے میں سب کی رائے الگ الگ تھی۔ لیکن حویلی کے اندرونی حصے
ڑ کر دیکھنے کی کسی کو بھی اجازت نہ تھی کیونکہ ایسا کرنے پر اس کی جواب دہی
عائد ہوتی تین ماہ کے نوٹس کی معیاد پوری ہو جانے پر جب حویلی کا
ی وارث نہ ہوگا۔

اس وقت حکومت اپنی نگرانی میں خود ہی اس کا فیصلہ کر دے گی۔ اس جگہ
نے والوں کی سہولت کے لیے قرب و جوار کے دیہاتیوں نے چھوٹی چھوٹی
یں بھی کھول لی تھیں۔

ام کے وقت ان دوکانوں پر اچھا خاصا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ زاہد کا خیمہ
ے کچھ ہی فاصلے پر تھا منزلہ لاہور ہی میں تھی کسی امکانی خطرے کے باعث
اسے روکنا بھی چاہا تھا۔ لیکن وہ اپنی اس خواہشوں کا اظہار نہ کر سکی تھی۔ شاید
بلا لاہور میں رہ کر زاہد کا دل اور بھی ویران رہے گا۔

زاہد سے قطع تعلق ہو جانے کے صدمے سے وہ یوں بھی کھویا سا رہنے
دیر سے گھر لوٹتا منزلہ اس کے لیے ٹیبل پر کھانا لگائے انتظار کرتی رہتی۔

کبھی

وہ

خاموشی سے کھا لیتا اور کبھی کھانے سے مقصداً انکار کر دیتا۔ مزلہ اس کے
پر خاموش ہی رہتی۔ اس کی بدمزاجی کا سبب وہ جانتی تھی۔ اور اسے یہ بھی ا
احساس تھا کہ ان حالات کو پیدا کرنے کی وہ خود ذمے دار ہے۔ اور دل کی تسلی
وہ اس گھڑی کو کوستی کرتی جب پہلی بار نواب ارجمند کی نظر اس پر پڑی تھی
مزلہ اور زاہد کے درمیان خاموشی کا ایک عجیب سا پردہ حائل تھا جسے
کبھی باہمی تناؤ کا نام دیا اور کبھی اسے شاہدہ کی جدائی سے وابستہ کر دیا
سے قطعی تعلق ہو جانے کا اسے اتنا ہی دکھ تھا جتنا زاہد کو۔

اور

اسی

لیے جب زاہد نے کریم نگر جاتے وقت اسے سلام کیا۔ تو وہ اسے روک نہ
اس کے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ زاہد نے بھرائے ہوئے الفاظ میں
امید ظاہر کی۔

"وہ ماں اب۔۔۔"

اس نے کہا تھا۔

"تم یہیں رہو شاید شاہدہ مجھ سے ملنے آ جائے اب۔۔۔"



اور

مزلہ

کی سسکیاں ابھر آئی تھیں۔ اس کے بیٹے کو شاہدہ پر کتنا زیادہ بھروسہ تھا!
وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ ایسے لوگوں کی سماج میں کوئی قدر نہیں جو سماج کے ماتھے کلنک
کا ٹیکہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور زاہد اپنی ماں کو کیسے یقین دلاتا کہ شاہدہ اس کے
ساتھ اپنی زندگی سے بھی زیادہ محبت کرتی ہے؟ وہ اس سے کبھی جدا نہیں
ہو سکتی۔

وہ اسے کیسے بتائے کہ شاہدہ اس کی زندگی کے دامن سے اس طرح بندھ چکی
ہے کہ اسے چھوڑنا چاہتے ہوئے بھی وہ نہیں چھوڑ سکے گی۔ یہی ایک امید تھی
جس نے اس کی ویران اور یاس انگیز زندگی میں ایک شمع روشن کر رکھی تھی۔
زاہد نے حویلی کو کئی بار دیکھا تھا۔ کئی بار وہ حویلی کے بالائی حصہ پر بھی گیا تھا
تنہائی میں وہاں کے یاس انگیز ماحول میں ڈوب کر جب بھی اس نے ان مظالم کا تصور
کیا جو اس کی ماں پر توڑے گئے تھے تو اس کی آنکھیں غمناک ہو جاتیں۔
اس کے چہرے کی مسلسل اداسی کا سبب کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے خود
بھی اس حقیقت کو پردۂ راز میں رکھا تھا۔ حویلی کے اندرونی برآمدے میں اور
کئی دوسری جگہوں پر اس نے اس قہقہے کی حقیقت کا راز معلوم کرنے کی کوشش
کی تھی جسے اس نے پہلی بار سب سے بالائی منزل پر اپنی ماں کے ساتھ سنا تھا۔

وہ

جاننا

چاہتا تھا کہ وہ کون شخص ہے جو اس طرح کی بربادی کا شکار ہو کر پاگلوں کی
طرح حویلی میں گھوما کرتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ یہ ضرور کوئی ایسا شخص ہے جو
نواب ارجمند کے ہاتھوں مشقِ ستم بن کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔
اور انتقام کی آگ دل میں جلائے دیواروں سے سر ٹکرایا کرتا ہے۔ ممکن
ہے اس دیوانے سے ملنے کے بعد اس کے دل کو بھی کچھ سکون مل سکے اپنے سے
زیادہ مصیبت زدہ کو دیکھ لینے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

ایک شام مزلہ کا خط ملا۔

کریم نگر اس علاقے میں ڈاک وغیرہ آنے کا کوئی براہِ راست انتظام نہیں
تھا۔ اس لیے یہاں کام کرنے والے سب لوگوں کے خطوط وغیرہ نزدیک کے
ڈاکخانے میں رکھے رہتے تھے۔ جنہیں یہاں کا ایک آدمی جا کر لے آتا تھا۔

خطوط

کے

چھانٹنے کا کام کیمپ کے ایک دفتر میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد انہیں بانٹ
دیا جاتا تھا۔ اس سے خطوط ملنے میں تاخیر ہو جاتی تھی۔ خط ملتے ہی اُس نے
اسے کھولا اور پڑھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے



پر مزدوروں کی کدالیں دے ماری ہوں۔

اس کی جان ہی نکل گئی۔

ضبط کا یارا نہ رہا۔ تو اُس نے دانتوں سے اپنے ہونٹوں کو اس سختی سے
کاٹا کہ خون کی بوندیں چھلک آئیں اور درد آنسوؤں میں بہنے لگا۔ ضبط کی طاقت
ٹوٹ ہی جاتی ہے۔ خط کے الفاظ پر اسے یقین ہی نہیں ہوا۔

ماں

نے

لکھا تھا کہ شاہدہ کی شادی ایک جاگیردار کے لڑکے کے ساتھ تین تاریخ کو
ہونا قرار پائی ہے۔

تین تاریخ ہے ——

آج تو چار تاریخ ہے اس کے دل پر آرے چل گئے۔ وہ رو پڑا۔ تڑپ
اُٹھا۔ شاہدہ تو آج اپنی سسرال بھی جا چکی ہو گی۔

بڑی

مشکل

سے اس نے خط کا باقی حصہ پڑھا۔ ماں نے اُسے پیار بھری تسلی دیتے
ہوئے التجا کی تھی کہ اب شاہدہ کو بھول جائے اس کی امید چھوڑ دے۔
خدا نے چاہا تو اُسے ایک سے ایک اچھی لڑکی مل جائے گی۔ خط کے آخر میں

ماں نے دعاؤں کے ساتھ اس کے پاس آکر رہنے کی خواہش کی تھی۔ اس کے لبوں سے ایک آہ ٹپک گئی۔

خط کو اس نے پھاڑ کر پھینک دیا۔

اور

سوچا

کہ ماں کو تو اب بلا ہی لے کیونکہ جس امید پر اسے وہاں چھوڑا تھا ٹوٹ چکی ہے ماں کے بغیر اس کا اپنا دل بھی نہیں لگتا تھا۔ شاہدہ سے ہرگز امید نہ تھی۔ ایک عورت اسے اپنا سب کچھ سونپنے کے بعد بھی دوسرے مرد کی آغوش میں جانا پسند کرے گی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا اپنے پریمی کو دھوکہ دیا ہے۔ اب اپنے شوہر کو دھوکہ دے رہی نفرت سے اس نے تھوک دیا۔ شاہدہ کے نام پر —— اس کے پیار محبت کے اعتبار پر۔ جس سے اس کے دل کو شدید چوٹ پہنچی تھی۔

وہ

کیمپ

سے باہر نکلا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا اپنا جال پھیلانے لیے بے چینی سے وقت کا منتظر تھا۔ آسمان شفق کی تجلیوں سے انگارہ ہوا تھا۔ آسمان کی وسعت میں اڑتے ہوئے پرندے جیسے سرخ



پہنے ہوئے تھے۔

سردی شدت کی تھی اس لیے مزدوروں نے الاؤ جلا دیئے تھے تمام دن کی محنت سے چور کچھ مزدور ابھی سے کمبل تان کر لیٹ چکے تھے۔ وہ نائٹ گاؤن پہنے آگے بڑھ گیا۔ درد سے دل کی رگیں پھٹ رہی تھیں اور اسی لیے دل و دماغ پر ایک عجیب سی دیوانگی کا احساس لیے وہ جلد از جلد حویلی کے ہیبتناک ماحول میں کھو جانا چاہتا تھا۔ انسان کو ایسے وقت تنہائی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

جب

وہ

دنیا میں کسی کو بھی اپنا محسوس نہیں کرتا۔ شاہدہ نے اُسے کیا ٹھکرایا؟ جیسے ساری دنیا ہی نے اُس سے منہ پھیر لیا تھا۔ حویلی کے گیٹ پر پہنچ کر بھی اسے ٹارچ جلانے کی یاد نہیں آئی۔ وہ تو جیسے اپنے دماغ کا توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔

برآمدہ عبور کرنے کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھا اور سب سے بالائی منزل پر جا کھڑا ہو گیا۔ زاہد بہت دیر تک بت بنا سامنے کے ماحول میں جانے کیا تلاش کرنے لگا۔ شاید ان لطیف لمحوں کی تصویر کھینچ رہا تھا جو اس نے شاہدہ کی قربت میں رہ کر لندن کی زندگی میں گذارے تھے۔ اسے وہاں کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی۔

یہاں تک کہ شفق کی سرخی نے بھی دم توڑ دیا۔ سامنے کے سوکھے درختوں

پر دور دور تک اندھیرے نے اپنا جال پھیلا دیا۔ صرف سرخی کی لو کانپ رہی تھی
جہاں جہاں مزدوروں نے آلاؤ روشن رکھے تھے۔ پورے چاند کی رات نہ ہوتے
ہوئے بھی کافی چاندنی پھیلی ہوئی تھی تاروں کے جھرمٹ میں چاند کا چہرہ پھیکا
سا دکھائی دے رہا تھا ——

---



تا زاہد کی نگاہ ایک کار پر پڑی جس کی ہیڈ لائٹیں روشن تھیں اور جو
مزدوروں کے ٹھکانوں کے قریب آکر رک گئی تھی۔

ڈ

روشنی میں اس نے دیکھا کہ چند مزدور کار دیکھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ قریب
اس کے خیمے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کار آگے بڑھ
ے خیمے کے پاس رک گئی ہے۔ وہ چونکا کون ہو سکتا ہے؟ اس کا
زور سے دھڑکنے لگا۔
ہا کہ اُتر کر اس طرف جائے کہ اسی درمیان میں چند لوگ کار سے باہر اُتر کر
ہو گئے۔ ایک شخص بڑھ کر خیمے میں بھی گیا۔ لیکن فوراً باہر آگیا۔ زاہد سمجھ

نہیں سکا کہ یہ کیا معاملہ ہے ؟۔

پھر

بھی

اخلاقاً وہ ان سے ملاقات کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ معاً چلتے چلتے اُس نے دیکھا کہ وہ سب تیزی سے حویلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُس نے وہیں ٹھ مناسب سمجھا۔ اس نے دور ہی سے انہیں پہچاننے کی کوشش کی۔ کچھ مر تھے اور شاید دو عورتیں۔ قدموں کی رفتار سے ان کی عجلت کا پتہ چلتا تھا۔ کو زاہد نے کسی انجانی مصیبت کا پیش خیمہ سمجھا۔

ایک بار پھر اُس نے غور طلب نظروں سے دیکھا۔

ایک عورت نے بہت عجلت کے ساتھ گیٹ کھولا اور اس سے آگے بڑھی جیسے پہلے بھی کبھی اس حویلی میں آچکی تھی برآمدے میں پہنچتے پہنچتے وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے لیکن چند ہی لمحے بعد بہت سرعت سے زینہ چڑھتے ہوئے قدموں کی آواز گونجی۔

اور ساتھ ہی زیر لب باتیں کرنے کی دبی دبی سی آوازیں بھی اُس کے کا میں آنے لگیں معاً لوگوں کی ایک بھیڑ نے اس کے قریب پہنچ کر اسے چارو طرف سے گھیر لیا۔ اس وقت وہاں سب لوگ موجود نہیں تھے۔ شاید میں سے کچھ حویلی میں کسی کو تلاش کرنے کے لیے نیچے بھی رہ گئے تھے۔



"کہاں ہے میری بچی ——"

ایک محترمہ نے آگے بڑھ کر زاہد سے سختی سے پوچھا باقی لوگوں نے اسے گھور دیکھا۔

"بچی! کیسی بچی ؟ ——"

زاہد کو ان کے وہاں اچانک آنے کے علاوہ ان کے سوال پر بھی حیرت ہوئی ان لوگوں کو اس نے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔

"ہاں! ہاں میری بچی شاہدہ! ——"

محترمہ نے پھر کہا۔ لیکن اس دفعہ لہجہ مزید سخت تھا۔

"اوہ! ——"

زاہد نے مسکرانے کی سعی کرتے ہوئے سلام کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

"آپ ہی شاہدہ کی ممی ہیں! ——"

"ہاں ہاں میں ہی اس کی ماں ہوں ——"

محترمہ نے تنک مزاجی سے کہا۔

"بتاؤ میری بچی کہاں ہے ؟ ورنہ پولیس سے تمہاری کھال کھنچوا لوں گی!"

"محترمہ! میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

زاہد نے تحمل سے کام لیا۔ اگر یہ شاہدہ کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ ایک ہی آواز میں اپنے مزدوروں کو بلا کر ان کے ہوش ٹھکانے کرا دیتا اور ان کے اس برتاؤ

پر مزا چکھا دیتا۔

اُس نے کہا۔

"بھلا آپ کی بیٹی کا اب مجھ سے کیا متعلق رہ گیا ہے؟ ۔۔۔"

"اتنے بھولے مت بنو زاہد! ۔۔۔"

قریب کھڑے ہوئے ایک رنگین سوٹ والے نوجوان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اُس کی مٹھیاں کسی ہوئی تھیں۔

"اگر شاہدہ کا پتہ نہ چلا تو ہم تمہیں اٹھا کر یہیں سے نیچے پھینک دیں گے ۔۔۔"

"آپ کی تعریف ۔۔۔"

زاہد نے اس کے پاگل پن سے اُکتا کر شاہدہ کی ممی سے پوچھا۔

"کیا یہ شاہدہ کے بھائی ہیں۔"

"شٹ اپ! ۔۔۔"

نوجوان برگشتہ سا ہو کر چیخا۔ اور اپنے کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے بولا۔

"میں شاہدہ کا منگیتر ہوں! ۔۔۔"

"اوہ! سوری! ۔۔۔"

زاہد تلخی سے مسکرایا۔



"تو پھر شادی کیوں نہیں کی؟ ۔۔۔"

شادی اس لیے نہیں ہو سکی کہ بارات پہنچنے سے پہلے ہی ایک گندی نالی کے
ے نے اسے بہلا پھسلا کر اپنے پاس بلا کر چھپا لیا ہے۔"

دفعتاً دوسرے پہلو میں کھڑے ہوئے ایک بزرگ ۔ اکھڑ شخص نے اپنی
سفید مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"پولیس کو ہم درمیان میں لا کر کسی طرح کی بدنامی مول لینا نہیں چاہتے اس لیے
بہتر ہوگا کہ تم چپ چاپ سیدھی طرح شاہدہ کو ہمارے حوالے کر دو! ۔۔۔"

اسی

اثناء

میں تین غنڈے جیسے شخص وہاں پہنچے تو زاہد کچھ کہتے کہتے رک گیا اور صرف
دانت ہی پیس سکا۔

"کوئی ملا ۔"

رنگین کوٹ والے نوجوان نے مضطرب لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں مالک ادھر تو کوئی بھی نہیں۔ ہم نے ایک ایک چپہ دیکھ ڈالا۔
صرف کمروں میں نہیں دیکھ سکے کیونکہ باہر سے قفل لگے ہوئے ہیں۔"

"ٹھہرو! ۔۔۔"

یکایک شاہدہ کی ممی نے کہا۔

"تالا میں تڑواتی ہوں!——"

"آپ اس حویلی کا تالا ہرگز نہیں تڑوا سکتیں۔ کیونکہ اس کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ حویلی میری نگرانی میں ہے——"

زاہد نے طیش میں آکر کرخت لہجے میں کہا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے منع کرنے والے!——"

شاہدہ کی ممی چیخیں۔

"اس حویلی پر تو میرا حق ہے۔ اس کے ایک ایک کونے سے میں واقف ہوں۔ یہیں میرا بچپن گذرا ہے۔ اس کے سائے میں پل کر میں جوان ہوئی تھی۔ اسی محل میں آکر میرا دولہا ٹھہرا تھا۔ مجھے تو اخبار کی خبر سے علم ہوا کہ یہ حویلی اور سارا علاقہ ویران ہو چکا ہے۔ نواب ارجمند نہیں رہے۔ ورنہ ان کی عیادت ہی میں ہم اسے برباد ہونے سے روک لیتے——"

"دیکھو برخوردار!——"

اچانک وہ بزرگ شخص اپنی مونچھوں کو اینٹھتے ہوئے بولے۔

"ہم زیادہ الجھن کے قائل نہیں۔ تمہاری ماں ہمارے قبضے میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شاہدہ کو ہمارے حوالے کرنے میں دیر ہو جانے سے تمہیں اس کی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔"

"کیا؟——"



زاہد یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو کر چیخ پڑا۔

"میری ماں کو تم نے بند کر رکھا ہے۔ کمینے ذلیل بزدل۔"

اس نے لپک کر اس شخص کی گردن پکڑ لی۔ اور چاہا کہ زور سے دبا دے لیکن بر وقت ب کھڑے ہوئے ایک غنڈے نے اسے پکڑ کر کھینچتے ہوئے الگ کر دیا۔

رنگین سوٹ والے نے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک بھرپور گھونسہ اس طرح مارا کہ زاہد لڑکھڑا کر پیچھے گر پڑا۔ اس نے اٹھنا چاہا کہ تبھی قریب کھڑے ہوئے غنڈوں نے اپنے چہرے ان لیے۔

"خبردار!——"

دفعتاً ایک گرجدار آواز کوٹھے کے ایک کنارے سے گونجی۔ آواز میں ایک حکم تھا۔ ایک چیلنج تھا۔

سب چونک پڑے۔ نگاہیں ایک سمت اٹھ گئیں بالاخانے کی برساتی کے ایک ستون کے پیچھے سے ایک سایہ اترا۔ ایک طویل قد و قامت والا سایہ۔ چال میں ایک شاہانہ جلال تھا۔ جھومتے ہوئے قدموں سے بڑھ کر جب وہ سایہ ان کے قریب پہنچا تو ایک بار اس کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھ کر سب کے دل

لرز گئے۔

سر کے بال لانبے ڈاڑھی اور مونچھیں ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئیں پرانا موٹا اوورکوٹ پہنے ہونے کے باعث اس کی شخصیت اور بھی پراثر معلوم ہوتی تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک تعلیم یافتہ پاگل دکھائی دیتا تھا۔

زاہد جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے بغور اس دیوانے کو دیکھا کون ہو سکتا ہے؟ کون؟ کہیں ماں اسی کا سایہ دیکھ کر تو روح نہیں سمجھ بیٹھی تھی۔ شاید یہی وہ پاگل ہے۔ جو حویلی کی دیواروں سے سر پھوڑتا رہتا ہے۔ نواب ارجمند کی بربادی پر قہقہے لگاتا رہتا ہے۔

نووارد نے

قریب آ کر زاہد کو بہت غور سے دیکھا۔ کچھ ایسی نظروں سے آس اور پاس کے ملے جلے ایسے دکھتے ہوئے تاثر کے ساتھ کہ زاہد کا دل بہت زور زور سے دھڑک اٹھا۔

"اے پاگل چل بھاگ یہاں سے ا۔۔۔"

بوڑھے شخص نے اسے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کیوں اپنی جان ایک ایسے آدمی کے لیے دینے پر تلا ہے۔ جو اپنے باپ کا نام تک نہیں جانتا؟۔۔۔"

"احمد خاں ا۔۔۔"



نووارد دیوانہ بہت زور سے چیخا۔ ایسی چیخ جو کریم نگر کے کونے کونے میں زور گونج اٹھی ہو گی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"احمد خاں ا۔۔۔"

اس بڑھے شخص نے اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم میرا نام ہی جانتے ہو؟۔" حیرت کے لمحات گذرنے لگے۔

---

باقی سب لوگ بھی حیرت زدہ سے رہ گئے۔ ایک دوسرے کا منہ تکنے کے بعد وہ پھر نووارد کی طرف دیکھنے لگے۔ جس کی آواز میں ایسا تحکمانہ رعب تھا جو کم ہی لوگوں کی آواز میں ہوتا ہے۔

"میں تم میں سے کسی کو نہیں جانتا۔"

نووارد نے اپنے دانت پیسے اور آگے بڑھ کر بولا۔

"تمہارے تو باپ دادا تک کے نام میں گن سکتا ہوں۔"

وہ

ایک

ادھیڑ عمر لیکن ضرورت سے زیادہ سجی دھجی عورت کی طرف متوجہ ہوا جو شاہدہ کی ممی کے قریب کھڑی دیر سے زاہد پر اس بلی کی طرح نظریں جمائے ہوئے



تھی جو اپنے شکار پر جست لگا حملہ کرنے کی منتظر رہتی ہے۔ "و تم......"

نووارد نے بہت حقارت سے اس پر طنز کیا۔

"تم جمیلہ ہو۔ تمہاری تو ایک ایک سن سے میں واقف ہوں۔ جس چیز سے تم محروم رہتی ہو۔ اسے چھین کر اپنا لینے میں تمہارا خاندان فخر سمجھتا ہے۔"

"ارے پاگل ہے——"

دفعتاً رنگین سوٹ والے نے اس کا کالر پکڑ لینا چاہا لیکن نووارد نے بہت آسانی کے ساتھ اسے جھٹک دیا۔ وہ نوجوان گرتے گرتے بچا۔

"تم بھی جمیلہ کی اولاد ہو ا——"

نووارد نے بہت گھور کر اسے دیکھا۔ بہت نفرت سے بولا۔

"کیوں؟ سانپ کی اولاد سانپ نہیں ہوگی تو کیا ہوگی؟——"

"کون ہو تم؟ کون ہو؟——"

احمد خاں نے اسے گھورا۔ چاندنی کی جھلک میں وہ اسے ٹھیک سے نہیں پہچان سکا تھا۔

لیکن

جمیلہ

نووارد کی بات سن کر کانپ اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ایسی مٹ گئی تھی جیسے اس کے ارمانوں پر بجلی گر پڑی ہو۔

خوف زدہ
سی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ نووارد کو اس طرح دیکھنے لگی۔ جیسے وہ کوئی
جیتا جاگتا انسان نہیں۔ کوئی روح ہو۔ اوپر سے نیچے تک۔ اُس کا پورا جسم کانپ
گیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ حقیقت پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔
کبھی قصر دل میں بیٹھا کر اس نے نووارد کی پوجا کی تھی۔ تصور میں اس تصو
کا بوسہ لیا تھا۔ برسوں تک اس کے لیے سنہرے خواب دیکھے تھے۔
آج اسے اس بے مائگی کی حالت میں دیکھ کر اُسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا
"نواب ارجمند خاں !——"
خوف وحیرت سے اس کے کانپتے ہوئے لبوں سے نکل ہی گیا۔
جمیلہ کے ہونٹوں سے یہ الفاظ کیا نکلے جیسے بم پھٹ پڑا اور اس کے دھما
سے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کے کان بہرے ہو گئے۔ سب نے اوپر سے نیچے
تک اُسے غور سے دیکھا۔ کسی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہیں ہو رہا تھا۔
لیکن سچائی
سے لوگوں کے دل بری طرح دھڑکنے لگے تھے۔ یہ کیا ہے ؟—— یہ سب
کیا ہے ؟ کوئی کچھ جانتا نہیں تھا اور جاننے کا حوصلہ بھی نہیں کر سکا۔
شاہدہ کی ماں کی تو جان ہی نکل گئی۔ پورا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ ددندم
پیچھے ہٹ کر اُس نے گھٹنوں کے بل جھک کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔



"نواب صاحب آپ !——"
اسے اب بھی یقین نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس کے آنسو چھلک آئے۔
"ہاں ندیمہ ! میں ہی بدنصیب نواب ارجمند ہوں۔"
نووارد کا
غصیلہ لہجہ سنجیدگی میں تبدیل ہو گیا۔
"میں تمہاری باتیں بہت دیر سے سن رہا تھا۔ لیکن ضبط نہ کر سکا تو سامنے آنا ہی
مجھے نہیں معلوم تھا کہ زاہد تمہاری بیٹی شاہدہ کو پیار کرتا ہے۔ ورنہ میں اس
پیار کی رسوائی ہرگز نہ ہونے دیتا۔ زاہد کی رگوں میں گندی نالی کا پانی نہیں ندیمہ !
میرا خون ہے۔ زاہد میرا بیٹا ہے۔ میرا حقیقی بیٹا !—— اس کی رگوں میں نواب
ارجمند کا خون جوش مار رہا ہے——"
"اوہ !——"
وہ سسک پڑی۔ بڑھ کر وہ نواب ارجمند کے گھٹنوں سے لپٹ گئی اور
پھوٹ پھوٹ کر بولی۔
"یہ سب کیا ہو گیا ؟"
اُس نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔
"انجانے میں مجھ سے کتنا بڑا قصور ہو گیا۔
مجھے معاف کر دیجیے۔ . . . . . مجھ گنہگار کو معاف کر دیجیے ؟

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

ندمیہ

اپنے

آنسوؤں سے اُن کے قدم دھونے لگی۔ چاہا کہ ان کے قدموں میں اپنا سر ٹیک دے لیکن نواب نے جھک کر اسے اٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو جذب کئے۔ جھلکتی چاندنی میں اس کے چہرے کو دیکھ کر ان کی اپنی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔

جمیل کے خدوخال کی ایک جھلک آنکھوں میں رقص کر گئی۔ کیونکہ ندمیہ کی آنکھوں میں ہو بہو وہی کشش تھی۔ ندمیہ ان کے سینے پہ منہ رکھ کر سسک پڑی۔ وہ بھی شفقت سے اس کی پشت پر تھپکی دینے لگے۔

ایک

لمحے

کے لیے سب حیرت زدہ رہ گئے۔ خاموش کھڑے بغلیں جھانکنے لگے۔ احمد خاں نے آگے بڑھ کر معاملے کو سنبھال لینے کی کوشش کی۔

"خیر جو کچھ بھی ہوا اچھا ہی ہوا۔۔۔"

انہوں نے ایسے انداز میں کہا۔ جیسے اپنا دامن بچا رہے ہوں۔

"بچھڑے ہوئے لوگ؟۔۔۔"



نواب کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی وہ بولے۔

"مزلہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ کبھی نہیں اور شاید میرا بیٹا بھی مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔۔۔"

زاہد کے دل پر چوٹ لگی اس نے نواب ارجمند کی جانب غور سے دیکھا۔

"کیوں؟۔۔۔"

ندمیہ نے پوچھا۔۔۔

"تمہیں جمیل نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی کچھ نہیں بتایا۔۔۔"

نواب نے پوچھا۔

"نہیں!۔۔۔"

ندمیہ نے کہا۔۔۔

"وہ تو ہماری کوٹھی پہنچنے کے بعد ایسے بیمار پڑے کہ ان کی آواز ہی بند ہو گئی ہاں۔ مرنے سے پہلے اچانک ان کی قوتِ گویائی عود کر آئی تو ان کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا۔ مزلہ نواب صاحب یہ بات تو میں نے آپ کو پہلے ہی لکھی تھی۔"

"ہاں!۔۔۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد ان کی ایسی حالت ہو گئی تھی ورنہ میں خود اسے دیکھنے کے لیے جاتا۔۔۔"

نواب ارجمند کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیوں میری ماں آپ کو معاف نہیں کرے گی؟ اور کیوں میں آپ کو اپنا

باپ نہ مان کر ایک پاپی بننا زیادہ اچھا سمجھوں گا ؟"

اچانک

زاہد نے

ایسے لہجے میں پوچھا۔ جیسے وہ ان کی بے رحمی کے متعلق کچھ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"اس لیے بیٹے کہ تمہاری ماں کے دل میں میرے بیٹے پیار سے زیادہ نفرت کا جذبہ ہے۔"

نواب نے ایک آہ بھری۔ ندیمہ علیحدہ ہو کر اپنے آنسو جذب کرنے لگی نواب صاحب نے بات جاری رکھی۔

"اس نے صرف میری سنگدلی کا پہلو ہی دیکھنے کی کوشش کی ہے اس قربانی اس ریاضت اور پوجا کو اس نے قطعی نظر انداز کر دیا ہے۔ جو آج تک میں اس کے لیے کرتا آیا ہوں ——"

"قربانی ریاضت ا——"

زاہد نے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں ا——"

اب نواب ارجمند نے صاف الفاظ میں اپنی زندگی کا سارا المیہ بتا دینا ہی مناسب سمجھا۔ انہوں نے کہا۔



"جس حویلی کو تم آج سنسان اور ویران۔ بھوت اور آسیب کے کھنڈروں (حا)ل میں دیکھ رہے ہو۔ پہلے ہی ایسی کبھی نہیں تھی۔ پہلے یہاں پھولوں کی رعنائی کلیوں کی مسکراہٹ تھی۔ رنگ محل کی گل اندام کنیزوں کی پائلوں کی چھم چھم (م)ستی میں ڈوبی ہوئی زندگی تھی اور زندگی کے حقیقی قہقہوں قہقہوں میں ڈوبی ہوئی (چ)ہل پہل تھی۔

اس

رنگ محل

کی دیواروں پر پرندوں کو بھی پر پھڑپھڑانے کی اجازت نہیں تھی ——"

معاً نواب نے آگے بڑھ کر حویلی کے عقبی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تالاب جو آج موت کے کنوئیں کی صورت بھیانک اور ویران ہے ہمیشہ عطر سے لبریز رہتا تھا۔ جل پریوں کی طرح حسین دوشیزائیں اس کی رونق کو دوبالا کرتی رہتی تھیں۔ اور وہ —— وہ دوسری طرف ا——"

حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ اور بولے۔

اس لان میں بیٹھ کر لحہ دو لحہ لطف اندوز ہوتے جو کہ ملکی اور غیر ملکی رئیسوں اور افسروں سے ملنے کی جگہ تھی۔ وہ لوگ یہاں بیٹھنا اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے یہ لان ہمیشہ طرح طرح کے رنگین پھولوں کی خوشبوؤں سے کھیلا رہتا تھا۔

پھولوں کے

قریب جانے کے لیے یہاں بھنوروں کو بھی ہماری اجازت لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔"

اُنہوں نے زاہد کی طرف دیکھا۔ اور قریب آتے ہوئے بولے۔

"یہ سب میں نے اپنے پیار، اپنی ریاست اور محبت پر قربان کر دیا۔ رنگ محل کو بھوت محل میں تبدیل کروانا۔ میرا کام تھا۔ یہ سب اس لیے کیا کہ یہ مزلہ کی خواہش تھی اور اس لیے بھی کہ مجھے میرے گناہوں کی معافی مل سکے۔ مزلہ مجھے معاف کر دے۔ کچھ سال تو اس امید پر کاٹ دیئے کہ وہ مجھے اپنا لے گی مگر اب تو معافی کی امید ٹوٹ گئی۔" ان کے لبوں کو ایک یاس انگیز آہ چھوڑ گئی۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔

"شاید میں اسی سزا کے لائق تھا۔ اس لیے اس حویلی کی چہار دیواری کے اندر چھپ کر اپنی محبت کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ جب اس حویلی کا کوئی وارث نہیں نکلے گا تو یقیناً نیلام میں خریدنے کے بعد اس کا خریدار اسے بھوت پریت کا کھنڈر سمجھ کر اسے گروا کر نئی عمارت بنوانا پسند کرے گا تب میں اس کی ٹوٹتی دیواروں سے اٹھتی ہوئی غریبوں کی آہ و بکا کو سننا چاہتا تھا۔ اس کی بنیاد میں خون کی اس سرخی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

جیسے ہمارے

اجداد نے اس علاقے کی معصوم جوانیوں کے جسم سے نچوڑا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا



ھا کہ خون کی یہ سرخی کچھ کہتی بھی ہے۔ چلاتی بھی ہے یا نہیں اب ــــ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ میں نے اپنا سب کچھ فروخت کر کے تمام روپیہ پہلے ہی تمہارے نام اسٹیٹ بنک میں جمع کر دیا ہے۔

"میرے نام اب ــــ"

زاہد نے حیرت سے پوچھا!

"ہاں اب ــــ"

نواب نے آہ بھر کر کہا۔

"تمہارے اور مزلہ کے علاوہ میری سانسوں میں دھڑکن بھی نہیں ہے؟ سوچا تھا۔ میرے جیتے جی نہ سہی۔ مرنے کے بعد ہی مجھے معاف کر دو اس رات جب م مزلہ کے ساتھ پہلی بار یہاں آئے تھے تو میں نے اچانک ہی تم دونوں کو لوٹتے رات دیکھ لیا تھا۔ پھر جب دل نہ مانا تو کیمپ تک بھی چلا گیا تھا۔ لیکن شاید زلہ کو اس کا علم ہو گیا۔ اس لیے واپس آنا پڑا۔ اس حویلی میں جانے کتنے ایسے پوشیدہ استے ہیں جن کے ذریعے آسانی کے ساتھ کہیں بھی آیا جایا جا سکتا ہے۔"

نواب ارجمند خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

شاید ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا باقی تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

سب لوگ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ لیکن احمد خاں نے سمجھا یہ داستان اب ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے اُنہوں نے زاہد کے شانے پر ہاتھ

رکھتے ہوئے شرمندگی کے لہجے میں کہا۔

"مبارک ہو بیٹے! خوشی کی یہ گھڑی مبارک ہو۔ کیونکہ آج تمام باتیں سامنے ہو گئیں۔

اب تو تم بتا ہی سکتے ہو کہ شاہدہ کہاں ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات دوسروں کے کانوں تک پہنچ جائے اور شاہدہ کے خاندان کے ساتھ ساتھ ہماری بھی بدنامی ہو۔"

"لیکن میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ شاہدہ کے متعلق مجھے کچھ بھی علم نہیں۔"

زاہد نے چونک کر کہا۔

"آپ کو اپنی بدنامی کا خدشہ کیوں ہو رہا ہے۔"

یکایک ندیمہ نے درمیان میں آ کر احمد خاں کو مخاطب کیا۔

"آنٹی! ـــــ"

قریب ہی کھڑا رنگین سوٹ والا نوجوان برگشتہ خاطر ہو کر چیخا۔

"شاہدہ میری بیٹی ہے ـــــ"

ندیمہ نے اس کی پرواہ کیے بغیر کہا۔

"اب اس کی شادی صرف زاہد سے ہی ہو گی۔ تم جیسے نیچ شخص سے نہیں ہو



یسی فرشتہ سیرت عورت کو اغوا کر کے مجھے سمجھا دیا کہ اگر زاہد نے شاہدہ کا بانے سے انکار کیا تو مزلہ کو مار دینے کی دھمکی دے کر اس کا پتہ چلانے میں آسانی بائے گی! ـــــ"

"زاہد بیٹے! ـــــ"

ندیمہ نے زاہد سے مخاطب کیا۔

"مزلہ نے تمہارا پتہ ہمیں اس لیے بتایا کیونکہ انہیں اعتقاد تھا کہ تم کبھی ایسا ا کام نہیں کر سکتے ہو؟ ـــــ"

احمد خاں کی ساری امیدوں پر پانی پڑ گیا۔

کتنی مدت کے بعد انہیں یقین ہوا تھا کہ دولت حاصل کرنے میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے جب سے جاگیریں چھنی تھیں قرض کے بوجھ سے دبتے دبتے اس قدر جھک گئے تھے کہ انہوں نے قرض اتارنے کے لیے غیر قانونی کام کیا اور اب تو انہوں نے اچھا خاصا اسمگلنگ گینگ سکول رکھا نے ھا۔

پھر بھی عزت سے رہنے کے لیے عزت سے کمائی ہوئی دولت اور اچھے تعلقات قائم رکھنا لازمی تھا۔ شاہدہ سے رشتہ قائم کر کے ان کے ڈوبتے کا پورا

حق ندیمہ کی دولت پر بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنا گندہ کام ہمیشہ کے لیے ترک کر کے وہ خود بھی اطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے۔

بڑے بڑے قرض بھی اتر جاتے تھے شب و روز پولیس کے خوف سے ان کی جان پہلے ہی سوکھی ہوئی تھی۔ جمیلہ کے سینے پر تو جیسے سانپ ہی لوٹ گیا۔ اپنے بیٹے کی خوش نصیبی پر ناز کرتے ہوئے اس نے اس گھڑی کو مبارک کہا تھا۔

---



جب ایک دن اچانک ہی احمد خان ندیمہ سے رشتہ پکا کر آئے تھے۔ اس کا باپ تو شاہدہ کو دیکھتے ہی مرمٹا تھا۔

رشتہ

ہو

جانے کے بعد اس نے کتنی آسانی سے ہزاروں نہیں لاکھوں روپے قرض لے لیے تھے تاکہ برات کے طمطراق میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ شادی کے بعد والدین کی ساری دولت کی مالک تنہا اس کا بیٹا ہوتا۔ اسی امید کے سہارے اس کے ڈاکٹر شوہر نے وہ سب سرکاری روپیہ بھی خرچ کر دیا تھا۔ جو فنڈ کے طور پر ہسپتال کی ترقی کے سلسلے میں اس کے پاس بطور امانت محفوظ تھا۔ اب اگر وہ روپیہ واپس نہ کیا گیا تو اسے سزا ہو جائے گی۔ اس پر کوئی عذر نہیں سنا

جائے گا۔

لیکن

سب

سے بڑی ناکامی جمیلہ کے لڑکے کو ہوئی۔ جو اندر ہی اندر غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ زاہد کا خون کر دے جس نے اس کے سارے خواب منتشر کر دیے تھے۔ خاندانی خون کا اثر نسل در نسل قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے نانا احمد خاں کی طرح ابتدا ہی سے وہ بھی ضدی اور آوارہ تھا۔

جوانی میں قدم رکھتے ہی اپنی جھوٹی شان کا اثر ڈال کر اس نے کتنی ہی لڑکیوں کو اپنے پیار کے جال میں اُلجھا رکھا تھا۔ کتنی ہی لڑکیاں اس کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھیں جن سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے منصوبہ بنا رکھا تھا۔

کہ شاہدہ سے شادی ہونے کے بعد وہ اُن کا کام تمام کر دے گا۔ لیکن شاہدہ کی ماں ندیمہ سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے بعد وہ غصے سے آگ بگولہ ہو اٹھا۔ مرتا کیا نہ کرتا؟ اُس نے جھٹ اپنا چاقو نکالا اور زاہد کے پیٹ میں پیوست کر دیا۔

زاہد لاپرواہی سے کھڑا اپنے رقیبوں کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ رہا تھا۔ چاقو کے آنتوں میں اُترتے ہی وہ تڑپ کر وہیں گر پڑا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بند ہوتی آنکھوں سے اُس نے ایسی مایوسی اور بے بسی کی نظروں سے نواب ارجمند



ہ جانب دیکھا۔ کہ نواب کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

اچانک

ان کے جسم میں جوانی کی قوت عود کر آئی۔ خون اُبل گیا۔ نہایت سرعت سے لپک کر اُنھوں نے جمیلہ کے لڑکے کی گردن دبوچ لی۔ ان کی آہنی گرفت میں تھی وہ دباتے ہی گئے۔ دباتے ہی گئے۔ یہاں تک کہ اُس کی آنکھیں نکلنے لگیں۔ آواز گھٹنے لگی۔ سانسیں رکنے لگیں۔ لیکن نواب ارجمند کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی۔ باقی سب لوگ دم بخود کھڑے زاہد کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ جس کے شکم سے خون کی دھار جاری تھی۔

اچانک ایک غنڈے نے نواب ارجمند کے سر پر ڈنڈے کا بھرپور وار کیا۔ نواب ارجمند کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جسم پہلے ہی کمزور اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ وار برداشت نہ کر سکا وہ لڑھک کر پیچھے گر پڑے۔ جمیلہ کے لڑکے نے اپنی حالت سنبھالی۔

"کمینے ذلیل، نیچ اب ــــ"

دفعتاً ندیمہ جیسے ہی بے ہوشی سے ہوش کے عالم میں آئی اور اس نوجوان کا کالر پکڑ کر چیخی۔

"تجھے میں جان سے مار دوں گی۔ تیری کھال کھنچوا لوں گی ــــ چھوڑ ڈاکو لٹیرے ــــ"

لیکن اس

نوجوان نے بغیر ایک لمحہ گنوائے ندمیہ کا ہاتھ پکڑا۔ اور اس کا منہ دبا دیا اس طرح کہ ندمیہ کی سانس گھٹنے لگے۔ پھر وہ احمد خاں کی طرف رجوع ہوا۔

"نانا جی! ــــ ہمیں اب ایک پل بھی گنوانا نہیں چاہیئے۔ اگر شاہدہ سے میری شادی نہ ہوئی تو ہماری ساری حقیقت کھل جائے گی۔"

بات احمد خاں کی سمجھ میں آگئی۔ جمیلہ نے بھی مایوسی میں امید کی ایک کرن دیکھ احمد خاں نے چاہا کہ اپنے غنڈے کی مدد سے ندمیہ کا منہ داب کر بے ہوش کر د تاکہ یہاں سے جاتے وقت اگر انہیں کوئی دیکھ بھی لے تو وہ بہانہ کر سکیں کہ اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ زاہد اور نواب ارجمند کو نیچے تالاب میں پھینکا جا سکتا تھا۔

لیکن ندمیہ ظالموں کی گرفت میں تڑپ رہی تھی۔ اور اسی کوشش سے خدا نے ایک موقعہ دے ہی دیا۔ اس کے منہ کی گرفت ڈھیلی ہوئی وہ پوری طاقت سے چیخی "بچاؤ...... بچاؤ......" دوسری بار وہ نامکمل لفظ ہی کہہ سکی تھی کہ ایک غنڈے نے اس کا منہ پھر داب دیا۔ اور دوبارہ اسے چلانے کا موقع نہ مل سکا۔

لیکن اس کی چیخ کی بازگشت رات کے سناٹے میں کریم نگر کے پورے علاقے میں دیر تک گونجتی رہی۔ اس کے کانوں نے ایسا ہی سنا۔

اس ایک آواز کی گونج سے باہر کیمپ کے اطراف میں کھلبلی مچ گئی۔ یکایک



یں ایک شور اٹھا۔

مزدوروں

نے

اپنی مشعلیں سنبھال لیں۔ دیگر کارکنوں نے ٹارچیں لیں اور ہاتھوں میں کدال بھی ہاتھ لگا۔ وہ بے کر حویلی کی سمت دوڑ پڑے رات کے وقت ان کا ھیر ایک ایسا منظر پیش کر رہا تھا جیسے کریم نگر کی رعایا نے وہاں کے راجہ کے لم سے تنگ آکر یکایک محل پر دھاوا بول دیا ہے۔

احمد خاں نے بالائی منزل کے کمرے کی اوٹ سے مزدوروں کو اس حالت حویلی کی جانب بڑھتے دیکھا تو ان کے ہوش ہی اڑ گئے۔

جمیلہ اور اس کے لڑکے نے بھی جب یہ ماجرا دیکھا تو حیرت سے ایک ے کو دیکھتے ہوئے وہاں سے بچ نکلنے کا ذریعہ تلاش کرنے لگے۔ یہ تو لینے ینے پڑ گئے۔

ایک غنڈہ اب تک ندمیہ کا منہ سختی سے دبائے ہوئے تھا۔ اس کے دروہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی حتی الامکان سعی کر رہی تھی۔

ان سب کو دیکھتے ہی ایک بڑی بھیڑ نے حویلی کا گیٹ کھولا اور اندر ٹوٹ ے۔ جگہ جگہ یہ ٹولیوں میں بکھر گئے جیسے وہ حویلی کے چپے چپے کو گھیر لینا چاہتے ں۔ اس آفت ناگہانی سے خوف زدہ ہو کر حویلی کے اندر جگہ جگہ کونوں میں

چھپے بیٹھے جانور اور پرندے بھی شور مچاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہ
اور اس سے پیشتر کہ احمد خاں اپنے گروہ کی حفاظت کا کوئی راستہ ڈ
نکالے مزدوروں کی ایک بڑی ٹولی بالائی منزل پہ پہنچ چکی تھی۔

ندیمہ

کو

ایک غنڈے کی گرفت پر کسمساتے ہوئے دیکھ کر ایک مزدور نے غن
پر کدال سے وار کیا۔ کدال غنڈے کی پشت پر پڑی اور وہ تڑپ کر ڈھی
ہو گیا۔ ندیمہ آزاد ہوتے ہی لپک کر مزدوروں ٹولیوں میں جا ملی۔

"پکڑ لو ان ڈاکوؤں کو ــــ"

اس نے احمد خاں کے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس کی
کانپ رہی تھی۔

"ان بدمعاشوں نے تمہارے افسر زاہد بابو کا خون کر دیا ہے ــــ"

ندیمہ کے یہ الفاظ سننے کی دیر تھی کہ مزدوروں کے درمیان ہلچل مچ گئی لیکن
اسی وقت احمد خاں نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

اس نے ہوائی فائر کیا۔

دھماکہ

اتنا شدید تھا کہ پورا علاقہ گونج اٹھا۔ لیکن نڈر مزدوروں پہ اس کا ا



بھی اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ اور بھی طیش میں آ گئے۔ احمد خاں پہ وہ بھوکے شیر کی طرح
ٹوٹ پڑے۔ پھر خوب ڈنڈے لاٹھیاں اور گولیاں چلیں۔ چند مزدور بھی گھائل ہوئے
لیکن رفتہ رفتہ وہ ان سب پر قابو پا گئے۔ جب مزدوروں نے احمد خاں کو دونوں
بازوؤں سے پکڑ کر ندیمہ کے سامنے کیا تو ندیمہ نے نفرت سے اس کے منہ پہ
تھوک دیا۔

"ان بدمعاشوں کو ہرگز مت چھوڑنا ورنہ تمہارے زاہد بابو کی ماں کی جان
خطرے میں پڑ جائے گی" ندیمہ نے مزدوروں کو تائید کی۔

مزدوروں نے

رسیوں سے سب کے ہاتھ مضبوطی سے پشت کے پیچھے باندھ دیئے
کچھ ندیمہ کی رائے سے انہیں اپنے نرغے میں لے کر سیڑھیاں اترنے لگے ادھر
کچھ مزدوروں کی مدد سے ندیمہ نے زاہد اور نواب ارجمند کو بھی اٹھوانے کا انتظام کیا
دونوں کو جلد از جلد ہسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ اور قریب سے قریب ہسپتال
ملتان ہی تھا جہاں ایسے خطرناک مریض کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جا سکتی تھی۔
تاخیر کرنے سے حالات خوفناک صورت اختیار کر سکتے تھے۔

شاہدہ اپنی

ماں سے ضد کرتی رہی کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ شادی کرتی بھی کیسے؟ کسی
دوسرے کو تو وہ دھوکہ دے سکتی تھی۔ لیکن اپنے اندر کی اس عورت کو کس طرح

دھوکہ دیتی جسے وہ زاہد کے اعتقاد کے گلے کا ہار بنا چکی تھی۔

اپنا

دل

اپنا سکون اور اپنی زندگی لہذا اپنا پورا وجود ہی محبت کے داؤ پر لگا دینے کے بعد بھی ایک انجانے شخص کو اپنا شریک حیات بنا لینا اس کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ جسے کوئی بھی معاف نہیں کرتا۔

اسی لیے اُس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ یہ شادی رک جائے لیکن چونکہ دعوت نامے تقسیم کیے جا چکے تھے۔ مہمانوں سے پہلے ہی گھر بھر گیا تھا۔ والدین نے اسے بتائے بغیر ہی تمام ضروری چیزوں کا بندوبست کر لیا تھا۔

اس لیے اس کی خواہش اور دباؤ کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا لہذا عین شادی کے موقع پر وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اور لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رسوائی کے خوف سے وہ اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ چوری چھپے اسے تلاش کریں گے۔ اور وہ انہیں کسی حال میں ملنا نہیں چاہتی تھی۔

یہ

دد

جانتی تھی۔ کہ اس کے گھر والے شور نہ مچائیں گے بلکہ خاموشی کے ساتھ اُس



کی تلاش جاری ہو گی۔ وہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ وہ اب انہیں کسی حال میں بھی نہ مل سکتی تھی۔ بدنامی کے ڈر سے پولیس کے پاس رپورٹ کے لیے اُن کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

---

وہ جانتی تھی کہ اس کے والدین اس کے بیمار ہونے کا بہانہ تراش لیں گے۔
اس کے باوجود مہمانوں کے ذریعے اس کے فرار کی خبر اُڑے گی۔

مگر

اسے۔

اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ لڑکے کے والدین سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ ان کی لڑکی لاعلمی میں گھر سے بھاگ گئی ہے۔ دولہا والوں کو اگر اس کی تمنا ہو گی۔ تو وہ صبر و تحمل سے کام لے کر خاموشی اختیار کرتے ہوئے دوسرے موقع کے منتظر ہو جائیں گے۔ اگر ان کو اس رشتے کی تمنا نہ رہی تو اسے بدنام کر کے ٹھکرا دیں گے۔

دونوں ہی حالتوں میں بہتری اسی کے حق میں ہو گی۔ اگر شادی کا موقع ٹل گیا



تو وہ اپنی ممی سے صاف الفاظ میں کہہ دے گی کہ وہ زاہد پر اپنی دوشیزگی قربان کر چکی ہے ماں کے دل کو دھکا تو ضرور لگے گا۔ لیکن تب وہ اس کی خواہش کے آگے جھک کر زاہد کو داماد بنائے گی۔

اگر دولہا والوں نے اسے چھوڑ دیا تب بھی اسی کی جیت تھی۔ گھر سے اس کا فرار ہونا بیکار نہ جائے گا۔ پھر وہ اطمینان سے اپنی ماں کو اپنی موجودہ حالت سے متعلق بتا دے گی۔ شادی کے مخصوص وقت سے پہلے تک اس نے بہت چاہا تھا کہ وہ شادی سے انکار کرنے کی وجہ بتا دے۔

لیکن اس

کی ہمت جواب دے گئی تھی مسرت کے اس موقع پر ایسی تکلیف دہ بات سن کر اس کی ماں کی جان ہی نکل جاتی گھر میں کہرام مچ جاتا۔ ڈیڈی زہر کھا لیتے اور تب سماج صرف اسی کو گھر کی بربادی کا ذمے دار ٹھہراتا۔ وہ بھی دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ دن بعد جب وہ واپس آئے گی تو اس کے منصوبے کے مطابق رفتہ رفتہ گھر کا ماحول اپنے معمول پر آجائے گا۔

گھر سے فرار ہونے کے دو دن بعد ہی اسے گھر کی فکر ہوئی ایک دن تو کسی طرح محبت کے جوش میں کٹ ہی گیا۔ لیکن دوسری رات وہ ایک پل بھی چین کی

نیند نہ سو سکی۔ عجیب عجیب بھیانک خوابوں کے اثر سے اس کے دل کی بے چینی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اس لیے صبح ہوتے ہی اس نے ریٹر کو بلاکر ہوٹل کا بل ادا کیا۔

اور

ٹیکسی

سے اپنی کوٹھی چل پڑی۔ راستے بھر اس کا دل بری طرح دھڑکتا رہا۔ بارات لوٹ جانے پر گھر کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔؟

کوٹھی کے پورٹیکو میں پہنچ کر اس نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا۔ اور اطراف کے ماحول کا جائزہ لیا سوکھے اور مرجھائے ہوئے باسی پھولوں کی سجاوٹ اس طرح رو رہی تھی۔ جیسے وہاں کسی کی موت ہوگئی ہو۔ ایک گہری اٹوٹ خاموشی مسلط تھی۔

ٹیکسی کے چلے جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی گاڑی گیرج کے سامنے کھڑی ہے۔ ڈرائیور صفائی کرنے میں مشغول ہے۔ لیکن اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف بڑھ آیا۔

"چھوٹی مالکن!۔۔۔"

گھبرائے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

"آپ ابھی آرہی ہیں؟ آپ ابھی کہاں سے آرہی ہیں؟۔"

"کیوں؟۔۔۔"



اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس کا گھر سے بھاگ کر واپس آجانا کوئی خاص بات نہ تھی۔

"وہ جو مزلہ تھیں نا؟ وہی جو ایک بار آپ کے رشتے کے سلسلے میں یہاں آئی تھیں!"

"ہاں۔۔۔ ہاں کیا ہوا اُن کو؟۔۔۔"

شاہدہ کا دل انجانے طور پر دھڑکنے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا ہوگیا مزلہ کو؟"

"مزلہ بی بی کو نہیں ان کے بیٹے کو ہوا ہے؟۔۔۔"

"کیا ہوا ہے ان کے بیٹے کو؟۔۔۔"

شاہدہ کا دل اور زور زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے چیخ کر پوچھا۔

"جن سے آپ کی شادی ہونے والی تھی انہوں نے مزلہ بی بی کے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کر دیا ہے۔"

"کیا؟۔۔۔"

شاہدہ کی چیخ نکل گئی۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

شاہدہ تڑپ اٹھی۔

"بڑے صاحب اندر ہیں! ان ہی سے سب حال پوچھ لیجیے۔"

ڈرائیور نے کہا۔

شاہدہ ایک لمحہ گنوائے بنا اندر کی جانب بھاگی۔

اشرف خاں بیٹھک میں ایک صوفے میں دھنسے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پاس ہی ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔ جیسے کسی کال کے منتظر ہوں۔ شاہدہ ان کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی۔

"ڈیڈی ا___"

اس نے جیسے بے حد غصے میں کہنا چاہا۔ لیکن پھر یکایک نرم پڑ گئی۔

"ڈیڈی کیا یہ سچ ہے کہ زاہد پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے؟___"

"ہاں بیٹی ا___"

اشرف خاں نے ایک گہری سانس لے کر کھڑے ہوتے ہوئے اسے گلے سے لگا لینا چاہا۔ لیکن اچانک کچھ سوچ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"اچھا ہی ہوا بیٹی! جو تو گھر سے عین موقع پر فرار ہو گئی۔ اچھا ہی ہوا جو محبت کی خاطر تو نے سب کچھ ٹھکرا دیا۔ ورنہ ہماری مرضی سے تیری شادی ہو جاتی تو ہم اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پاتے۔ خاص طور سے میں جس نے خون کے رشتے کو مستحکم رکھنے کے لیے یہ بھی نہیں سوچا کہ انسانیت کا رشتہ اس سے کہیں بلند ہے۔ بیٹی تیری پسند کوئی معمولی پسند نہیں ہے



اس کا بیٹا ہے جس کی عنائتوں سے آج ہماری شان و شوکت قائم ہے___"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟___"

شاہدہ حیرت
سے انہیں دیکھنے لگی۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹی! زاہد نواب ارجمند کی اولاد ہے تو تو اچھی ح جانتی ہے کہ ہم ہمیشہ نواب ارجمند کے ہی گن گاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اندیہ کی شادی مجھ سے کروائی تھی ہماری بارات کا کس شان سے خیر مقدم کیا تھا۔ رنگ محل میں ہم ایسی عزت کے ساتھ مہمان بن کر ٹھہرائے گئے تھے ے متعلق کسی کے خواب و خیال بھی نہیں آ سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اب ارجمند کی حقیقی بہن کی شادی ہو رہی ہو۔ جس نے بھی وہ دھوم دھام دیکھی گی تا زندگی نہیں بھول سکے گا۔"

ایک
لمحے
کے لیے اشرف خاں اپنی زندگی کے سب سنہرے ایام کی بہاروں میں ڈوب ئے۔ پھر اچانک بولے۔ "نواب ارجمند فرشتہ ہیں ___ آج جو کچھ بھی ہمارے اس ہے۔ اُن ہی کا دیا ہوا ہے۔ لیکن ہم نے ان کے بیٹے کے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کی۔ زاہد کی ماں کی توہین کر کے انہیں گھر سے نکال دیا۔"

"مگر آپ کو کس نے بتایا کہ زاہد . . . . . . "

شاہدہ نے بے چین ہو کر پوچھنا چاہا۔

"ملتان سے تمہاری ماں کی ٹرنک کال آئی تھی ـــ"

اشرف نے اس کی بات کاٹ کر کہا ـــ

"یہ کب کی بات ہے ؟ ـــ"

"کل رات کی ! آج صبح تین بجے اس نے تمام باتیں ٹرنک کال سے مجھے بتلائی تھیں ۔ زاہد اس وقت ملتان کے ہسپتال میں ہے ۔ اس کی حالت بہت نازک ہے ۔ اب تک اسے ہوش نہیں آیا ۔ ہوش آنے پر تمہاری ماں مجھے پھر ٹرنک کال کرے گی ۔ اسی لیے بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہوں ۔"

"اوہ ! ڈیڈی ! یہ سب کیا ہو گیا ؟ ـــ"

شاہدہ

کی

جیسے جان ہی نکل گئی ۔ تڑپ کر بولی ۔

"مجھے فوراً ہی ملتان پہنچنا چاہیئے ! آپ بھی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے ہیں ؟"

"نہیں بیٹی ! ـــ میں ابھی نہیں جا سکتا ۔

انہوں نے کہا ۔



"اور ابھی تو بھی مت جا ۔ جس کام کو مجھے انجام دینے میں دشواری ہو رہی تھی وہ کام اب تو بہت آسانی سے کر سکتی ہے ۔ پہلے اس کام کا ہونا بہت ضروری ہے ۔"

"کیسا کام ؟ ـــ"

شاہدہ نے حیرت سے پوچھا ۔

"دیکھو بیٹی ! ـــ"

اشرف خاں نے اپنا چہرہ پھیر کر شرمندگی کے انداز میں کہا ۔

"اس وقت مزلہ پولیس سٹیشن میں بیٹھی ہیں ـــ"

"پولیس اسٹیشن ! ـــ"

"ہاں ! ـــ"

انہوں نے کہا ۔

"تجھے پہلے وہاں جا کر انہیں یہاں لانا پڑے گا ۔ ہم اپنی کرتوت پر شرمندہ ہیں ۔ اس لیے ان سے معافی مانگنا چاہتے ہیں ـــ"

"لیکن پولیس اسٹیشن وہ کیوں گئی ہیں ؟ ـــ"

شاہدہ نے اس پہیلی کو نہ سمجھ کر تلخی سے کہا ۔

"بیٹی ! جب تو اچانک گھر سے فرار ہو گئی تو ہمارا اندازہ ہوا کہ تو ضرور زاہد کے پاس گئی ہو گی اس لیے ہم احمد خاں کے ساتھ مزلہ کے گھر پہنچے تو وہ صاف انکار

کر گئی اور کہا کہ اُس کا بیٹا ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا ہمارے پوچھنے پر انہوں نے زاہد کا پتہ بتانے میں بھی حیلہ بہانہ کیا اس پر احمد خاں نے اسے اغوا کر کے اپنے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اُس کمینے نے ہمیں سمجھایا تھا کہ زاہد نے تمہیں چھپانے کی کوشش کی تو مزلہ کو زد و کوب کرنے کی دھمکی کام آئے گی ــــ"

"ڈیڈی ! ــــ"

شاہدہ لرز گئی۔ چیخ کر نفرت سے بولی۔

"یہ آپ لوگوں نے کیا کیا ؟ ایک شریف عورت پر اتنا بڑا ظلم۔ خدا ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آپ لوگوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر یہ بات کسی کے کانوں میں پڑ گئی تو ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے ــــ"

"بیٹی ! ــــ"

اشرف خاں اپنی حرکت پر بہت شرمندہ تھے اپنا منہ پھیر کر گلوگیر آواز میں بولے۔

"تجھے تلاش کرنے کے لیے ہمیں زمین و آسمان بھی ایک کرنا پڑتا تو ہم پس و پیش نہ کرتے۔ سب ہی ماں باپ کو اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے پھر تو تو ہماری ننھا اولاد ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ تیرے غائب ہو جانے کے بعد ہم خفت کے بار سے ڈوب مرنا چاہتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ احمد خاں نے



مانوں سے کہہ دیا کہ اچانک تیری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے بات بن ئی اور اسی لیے مجبوراً اس کے احسان سے دب کر ہمیں اس کی رائے کو تسلیم کرنا ڑا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ یہ سب اپنے خود غرض ارادہ کو کامیاب بنانے کے کر رہا ہے ! ــــ"

شاہدہ

آبدیدہ

ہو گئی۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔ وہ یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکی کہ جو قدم وہ اٹھا ہے صحیح تھا یا غلط۔ لیکن اس وقت جن حالات سے وہ دوچار ہو رہی تھی تیں اس کے حق میں مفید تھے کیونکہ اس کی زندگی برباد ہونے سے بچ گئی تھی۔

"میں نے مدیحہ کا فون پاتے ہی یہاں کے ڈی ایم کو فون کیا۔"

کچھ وقفے کے بعد اشرف خاں نے بات شروع کی۔

تحقیقات کرنے پر انہیں معلوم ہوا کہ ہیڈکوارٹرز ملتان صیغۂ پولیس کے ذریعے رسول ہو چکی ہے۔ پولیس نے اچانک ہی آج صبح پانچ بجے احمد خاں ر دھاوا کیا تو برآمدے میں مزلہ ہی نہیں بلکہ شہر کے چھنے ہوئے بدمعاشوں ج بھی مل گئی۔ اسمگل کیا ہوا مال تو اس قدر تھا کہ بس دیکھتے ہی بنتا تھا یال و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ احمد خاں بدمعاشوں کے ڑے گروہ کا سردار ہے۔

ایک لمحہ
سانس لے کر اشرف خاں پھر بولے۔

"میں نے پولیس ہیڈکوارٹرز فون کر دیا ہے۔ بیان لینے کے بعد منزلہ بی بی کو آزاد کر دیا جائے گا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ انہیں خود کس طرح لینے جاؤں؟ کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں گا؟ شکر ہے تم آگئیں بیٹی! اب تم ہی پولیس ہیڈکوارٹرز چلی جاؤ اور انہیں کسی طرح منا کر یہاں لے آؤ تاکہ میں اُن سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکوں۔ تمہارے ساتھ آنے میں انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا——"

اشرف خاں خاموش ہو گئے۔

شاہدہ

ایک

لمحے تک سوچتی رہی۔ چند خاموش لمحات کمرے کے سناٹے میں تحلیل ہو گئے پھر جب کچھ دیر بعد وہ چلنے کے لیے تیار ہوئی تو اچانک ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اشرف خاں نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔ ملتان سے ٹرنک کال تھی۔

"ہیلو ابا——"

انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

...... جانے ادھر سے کیا آواز آئی جسے شاہدہ سمجھ نہ سکی۔



پھر اشرف خاں نے کچھ جواب دیا —— کچھ سنا —— اور بھی کچھ سنا
ے پر پریشانی کی شکنیں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر کچھ مایوس سے ہو کر
وں نے کہا۔

"اچھا —— اچھا —— ہم لوگ شام تک پہنچ جائیں گے ابا——"

"............"

"کار سے ہی آئیں گے۔ ٹرین کا کوئی ٹھکانہ نہیں کتنی لیٹ ہو جائے——"

اشرف خاں کہہ رہے تھے۔

"............"

"ہاں ہاں —— منزلہ بی بی کو بھی لیتے آئیں گے——"

"............"

"نہیں معلوم ہو گا بھئی نہیں معلوم ہو گا——"

شاہدہ

کچھ

پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ کیونکہ اشرف خاں باتیں سننے میں مگن تھے انہوں نے
ارے سے اپنی بیٹی کو درمیان میں دخل اندازی کرنے سے منع کیا۔

"............"

جانے کیا بات دوسری طرف سے سنائی پڑ رہی تھی۔

"شکر ہے کہ نواب صاحب کی حالت تو بہتر ہے۔"
انہوں نے کہا۔

"شاہدہ بھی گھر واپس آگئی ہے!"

"..............."

"ہاں میں مزل بی بی کو لانے کے لیے اسی کو بھیج رہا ہوں!"

"..............."

"ٹھیک ہے ہم شام تک پہنچنے کی ضرور کوشش کریں گے۔"

"..............."

"کیا؟ وارڈ نمبر بی۔۱۴؟"

"..............."

"اچھا، اچھا"

"..............."

"بائی بائی!"

اور اشرف خاں نے ریسیور رکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ تو شاہدہ نے تشویش بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

---



"کیا باتیں ہوئیں ڈیڈی؟"
شاہدہ سے صبر نہ ہو سکا تو پوچھ ہی بیٹھی۔

"چوٹ نواب صاحب کو بھی آئی تھی۔ وہ اب ٹھیک ہیں۔ فکر کی کوئی
نہیں ہے۔"
اشرف خاں نے کہا۔

"لیکن زاہد کی حالت ابھی تک خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

شاہدہ
فکر مند
ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔

"اور یہ آپ کیا کہہ رہے تھے۔ کہ نہیں معلوم ہو گا۔ نہیں معلوم ہو گا۔"

"اوہ !۔۔۔" انہیں یاد آیا تو کہنے لگے۔

"تمہاری ماں نے اس بات کی تاکید کی ہے۔ کہ مزلہ بی بی کو ہرگز یہ علم نہیں ہونا چاہیئے کہ زاہد کی حالت ایسی خراب ہے اور انہیں یہ بھی علم نہیں ہونا چاہیئے کہ نواب ارجمند حیات ہیں کیونکہ مزلہ بی بی ابتدا ہی سے ان سے نفرت کرتی رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا نام سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو جائیں۔ یا ان کے دماغ کو کسی طرح کا صدمہ پہنچے۔ صدمہ کسی بھی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہر قدم نہایت ہوشیاری سے اور سوچ سمجھ کر اٹھانا ضروری ہے۔ زاہد کے ہوش میں آتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا اس لیے کسی بھی بات کی فکر نہ کرنا۔"

شاہدہ ان تمام باتوں کی گہرائی کو نہ سمجھ سکی تاہم اپنے ڈیڈی کی ہدایت کے مطابق اس نے مزلہ کو اپنے گھر لے آنا ہی مناسب سمجھا۔

جب وہ اپنی کار میں تھانے پہنچی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ مزلہ اپنا بیان درج



کرا چکی تھی۔ شاہدہ کو دیکھ کر اس نے اپنی نظریں چرا لیں۔ شاہدہ کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی۔ اس نے بڑے ادب سے اُسے سلام کیا۔

"ماں !۔۔۔"

اُس نے آنٹی کی بجائے اُسے ماں سے مخاطب کیا۔ محبت کی جو شیرینی لفظ ماں میں ہے وہ کسی لفظ میں نہیں۔ اور مزلہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے تپتے احساس پر کسی نے پانی کے ٹھنڈے چھینٹے دیے ہوں۔ اُس نے غور سے شاہدہ کو دیکھا اور پیار سے بھی۔

اس نے سوچا اس میں شاہدہ کا کیا قصور؟ اس کے بیٹے زاہد کو تو وہ دل و جان سے چاہتی ہے نہ چاہتی ہوتی تو عین شادی کے موقع پر اپنا گھر چھوڑ کر خاندان کی رسوائی کا خطرہ کیوں مول لیتی؟ اُسے اغوا کرنے والے لوگ تو احمد خاں کے آدمی تھے۔ جس میں اس کے والدین بھی شامل تھے۔ لیکن اس بے چاری کا ان سب سے کیا واسطہ؟ شاہدہ ابھی تک اُس کی آنکھوں میں بہت پیار سے جھانک رہی تھی۔

اس سوچ کے ساتھ اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ شدت جذبات سے اُس نے شاہدہ کو گلے لگا لیا۔ شاہدہ سسک پڑی تو مزلہ بھی صبر کھو بیٹھی۔

"میرے ساتھ چلو ماں !۔۔۔ میرے گھر !۔۔۔"

شاہدہ نے چند ساعت کے بعد کہا۔

مزلہ

نے

اُسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں ماں!"

شاہدہ بولی ——

"میرے گھر چلو ڈیڈی اپنے کئے پر بہت شرمندہ ہیں اسی لیے آپ کو لینے نہیں آئے وہ خود آپ سے معافی مانگنا چاہتے ہیں ماں کو بھی بہت شرمندگی ہے۔ مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ میرے ساتھ آنے سے انکار نہیں کریں گی۔"

مزلہ کے چہرے پر تبسم کی ایک لکیر پھیل گئی۔

آنکھوں میں ایک خواب سا لہرا گیا۔ زاہد دولہا ہے اور شاہدہ دلہن۔ بہو نے اس کے گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہے جھک کر اس کے قدم چھوئے ہیں اور اُس نے اُسے گلے لگا لیا ہے اور اس نے سچ مچ شاہدہ کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔

"چلو ماں! —— میرے گھر چلو نا ——"

شاہدہ نے ضد کی۔ اور مزلہ ایک لفظ کہے بغیر اس کے ساتھ تھانے سے باہر نکلی جہاں شاہدہ کی کار ان کی منتظر تھی ——

کار

اپنی



پوری رفتار سے ملتان کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔

وقت کی کمی کی وجہ سے وہ کار سے ہی سفر کر رہے تھے۔ ڈرائیور ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ اس لیے اشرف خاں گاڑی اُس کے حوالے کر کے اطمینان سے آگے بیٹھ گئے تھے۔ مزلہ اور شاہدہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ مزلہ نے اُنہیں معاف کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ سخت شرمندہ تھے۔ اور مزلہ سے آنکھیں چار کرنے میں بھی جھجک محسوس کر رہے تھے۔

کچھ دیر تک مزلہ اور شاہدہ آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ لیکن سفر کی طوالت نے آخر انہیں بھی خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ مزلہ سیٹ پر نیم دراز ہو گئی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ کیونکہ گذشتہ شب احمد خاں کے ہاں کال کوٹھڑی میں پڑے پڑے اپنے بیٹے کے لیے فکرمند رہنے کی وجہ سے ایک پل بھی نہیں سو سکی تھی۔

شاہدہ بھی

اس کے آرام میں مخل نہیں ہوئی اور ایک طرف ہٹ کر اس کے لیے جگہ کر کے پیار سے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور باہر کی میکانکی دنیا میں کھو گئی۔

اشرف خاں صاحب

اور شاہدہ نے مزلہ کو یہی بتایا کہ وہ لوگ کریم نگر جا رہے ہیں۔ اور چونکہ کریم نگر ملتان سے آگے ہی واقع ہے۔ اس لیے مزلہ کے لیے کسی شک کی گنجائش نہ رہی۔ رفتہ رفتہ دن ڈھل گیا۔ اور شام درختوں پر اُترنے لگی۔

آخر

گاڑی

شہر کے ہنگامے میں داخل ہوئی۔ ملتان کی سڑکوں پر گزرتی ہوئی بسوں کے دلخراش ہارن تانگوں کی گڑگڑاہٹ۔ شہر کا شور و شغب اچانک مزلہ کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اس نے دیکھا۔ کہ ان کی کار ہسپتال کے سامنے جاکر رک گئی۔ اس نے تعجب سے پہلے شاہدہ کو پھر اشرف خاں کو دیکھا۔

کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تین بج رہے تھے۔ ڈرائیور جیٹ کی رفتار سے گاڑی لایا تھا۔

"آؤ بہن! ——"

اشرف خاں نے بہت سنجیدگی سے مزلہ سے کہا۔ جیسے کسی راز پر پردہ ڈالنے کی سعی کر رہے ہوں۔

مزلہ کا دل بہت زور سے دھڑکا شاہدہ کار سے باہر نکل چکی تھی۔ اس لیے وہ بھی اس کے پیچھے اتر گئی۔ دل کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔

"کیا بات ہے بیٹی؟ ——"

اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے مزلہ نے پوچھا۔

"یہ تم لوگ مجھے کہاں لے آئے؟ ——"



ہسپتال کی عمارت پر اس نے ایک نگاہ ڈالی۔

"گھبراؤ نہیں بہن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اشرف خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزلہ کو اس کے بیٹے کی موجودہ حالت کے متعلق کس طرح بتائیں ——

"کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ ——"

مزلہ کی آواز میں یکایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔

یقیناً آپ لوگ مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہیں کہیں —— کہیں میرے لال کو کچھ نہیں ہو تو گیا ہے؟

"آخر کریم نگر جاتے جاتے آپ لوگ مجھے اس جگہ کیوں لے آئے ہیں کہاں ہے میرا زاہد۔ کہاں ہے میرا زاہد کہاں ہے وہ؟ ——"

مزلہ

کو

ایسا محسوس ہونے لگا۔

جیسے کہ اس کا دل ہی بیٹھ جائے گا۔ اس نے شاہدہ کی جانب دیکھا۔ تو وہ صبر نہ کر سکی تڑپ کر رو پڑی۔

"شاہدہ! —— شاہدہ!! ——"

مزلہ نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا اور چیخ کر پوچھنا چاہا۔

لیکن عین اسی وقت ایک ڈاکٹر جو کہ برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ اُن کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ کار کی چھت پر پڑا ہوا سامان دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر کار کی نمبر پلیٹ دیکھ کر وہ ان سے مخاطب ہوا۔

"کیا آپ لوگ اس گاڑی سے تشریف لائے ہیں؟۔"

"جی ہاں!——"

اشرف خاں نے جواب دیا۔

"یہ زاہد کی ماں ہیں۔"

ڈاکٹر نے مزلہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ جی ہاں!——"

اشرف خاں بولے۔

"زاہد کی حالت اب کیسی ہے؟۔"

"زاہد کی زندگی کے متعلق ابھی کوئی رائے نہیں دی جا سکتی——"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

"بے ہوشی میں وہ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا ہی رہتا ہے۔ ویسے آپ لوگ اُسے دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ ابھی ابھی اُسے خون دیا گیا ہے۔ اس لیے آپ اسے ڈسٹرب نہ کریں وارڈ نمبر بی——۴ سامنے ہی ہے۔"

"خون!——"



مزلہ سے نہ رہا گیا۔ تو اس نے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن زاہد کو ہوا کیا ہے؟——"

"ایک بے وقوف نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے اُس بے گناہ کو جان سے مار دینا چاہا تھا۔" اشرف خاں کو بات صاف کرنا ہی پڑی——

---

”کیا؟——“

مزلہ کی جان ہی نکل گئی وہ تڑپ کر چیخی۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کون تھا وہ بدمعاش
میں اس ظالم کا منہ نوچ ڈالوں گی میں .......... میں ........“

اور تبھی

جب ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ ہسپتال کے اندر بھاگی۔

ڈاکٹر نے اُسے بہت حیرت سے دیکھا۔ شاہدہ نے ڈاکٹر کو دیکھا پھر اپنے ڈیڈی
کی طرف۔ اس کے بعد وہ بھی نہایت تیزی کے ساتھ ہسپتال کے اندر چلی گئی۔
گھبرا کر اشرف خاں نے بھی قدم بڑھا دیئے، ان کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر بھی چل دیا۔
مزلہ کے ہوش وحواس گم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ تیزی سے اندر پہنچی۔ بالائی



ل جانے والی سیڑھیوں کے قریب دیوار پہ آویزاں پلیٹ پر وارڈ کے نمبر درج
پلیٹ پہ ایک تیز نظر ڈال کر وہ پھولتی ہوئی سانسوں سے اوپر چڑھ گئی۔
بالکونی میں پہنچ کر اس نے دیکھا۔ وارڈ بی ۴ سامنے ہی تھا۔ بھاگتی ہوئی
یک جھٹکے میں وارڈ کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی نرس
ناول پڑھ رہی تھی۔ مزلہ کو دیکھ کر وہ چونک پڑی اس سے قبل کہ وہ مزلہ کو
نے کی کوشش کرتی وہ زاہد کے سینہ سے لپٹ کر زار وقطار رونے لگی۔
اپنے بیٹے کو ایسی بے بسی کی حالت میں پڑا دیکھ کر وہ اپنے دماغ کا توازن
بیٹھی تھی۔ زاہد کے جسم کو حرکت ہوئی۔ شدت درد سے وہ کراہ اٹھا۔ لیکن مزلہ
یسے پاگل ہو رہی تھی۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ زاہد بے ہوش ہے!——

”میرے لال کیا ہو گیا ہے تجھے۔ میرے لال؟——“

وہ تڑپ کر بولی۔

”کس ظالم نے تیرے ساتھ یہ ظلم کیا ہے۔ کون ہے وہ نیچ؟ میں...... میں
ظالم کا منہ نوچ لوں گی بول میرے لال بول ..........“ اس کے رخسار
سوؤں سے تر ہو گئے۔

زاہد

بے ہوش

تھا اور اس کے ساتھ اس کے جسم کا ایک ایک عضو بے ہوش تھا۔

مگر کوئی عضو حرکت کر رہا تھا تو وہ تھا دل —— اس کا دل —— ؟

کانوں کے پردے بے ہوش ہونے کے سبب کچھ سن نہیں سکتا تھا۔

لیکن زبان حال سے کچھ ضرور کہہ سکتا تھا اور جو کچھ بھی وہ کہہ سکتا تھا۔ وہ زا
کے ہونٹوں کو مرتعش کرتا ہوا، بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو جاتا تھا اور جب لب کچھ
کھل جاتے تو اُس کی آواز صاف ہو جاتی تھی۔

وہ بے ہوشی کے عالم میں محسوس نہیں کر سکا کہ اس کے سینے پر سر رکھے اس
ماں رو رہی ہے۔ یا اس کے کان اس کی آواز سن رہے ہیں۔ اس کا دل کام کر رہا تھا
اس لیے دل کی پکار پھر ایک بار مرتعش لبوں پر آ گئی۔ اور درد سے کراہتے ہوئے
اُس نے کہا۔

"ابا جی ا——"

مزلہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

اس کو یقین ہی نہیں آیا کہ زاہد نے اپنے باپ کو پکارا تھا تو اس کا مطلب ہے
کہ اسے اپنے باپ کا پتہ چل گیا ہے۔ اور بے ہوشی کے عالم میں شفقت پدری
کا ترسا ہوا بچہ اپنے باپ کو پکار رہا ہے۔

"کیا کیا تیرا باپ زندہ ہے۔"

غصے سے اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"ہاں —— مزلہ بہن ——"



اس کا جملہ مکمل ہوتے ہوتے ندیمہ اندر داخل ہوئی اور مزلہ کو زاہد سے علیحدہ
تے ہوئے اس نے کہا۔

"زاہد کے والد نواب ارجمند ابھی زندہ ہیں ا——"

نرس

بدستور

خاموش کھڑی تھی۔ مزلہ کی حالت اس سے دیکھی نہ جا رہی تھی۔ ندیمہ کے
یچھے اشرف خاں مشاہدہ اور ڈاکٹر بھی چلے آئے تھے۔ پہلو کے کمرے سے ایک نیا
خص بھی آ کر زاہد کے کمرے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ بالکل دروازے کے
زدیک۔ دیوار کے سہارے۔ بوڑھا۔ بال لانبے۔ بے ترتیب اور نیم سپید
ڑھی اور مونچھیں بھی پکی ہوئی حرماں لیف چہرے پر دو آنکھوں میں زندہ رہنے
ی ایک امید طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرن کی طرح روشن تھی۔

اس امید کی کرن کو روشن رکھنے کے لیے اس نے ایک دم سے وارڈ کے اندر
اخل ہونا مصلحتاً مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مبادا زاہد اور مزلہ پر اس کی اچانک
جودگی کا غلط اثر پڑے۔ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر وہ یہ دیکھنا چاہتا
تھا کہ مزلہ نے اسے معاف کر دیا ہے یا نہیں۔ کان لگا کر وہ بہت دھیان سے
اندر کی گفتگو سننے لگا۔

"ان کی ملاقات زاہد سے حویلی میں ہی ہوئی تھی۔ وہاں وہ تنہائی میں گمنامی کی

زندگی گذار رہے تھے ——" ندیمہ کہہ رہی تھی ——

"اُف! میرے خدا یہ کیا ہو گیا! ——"

مزلہ نفرت سے دانت پیس کر اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔ وہ پوری بات سنے بغیر ہی بولی۔

"یہ کیا غضب ہو گیا؟ آخر میرے لاڈلے پر اس پاپی کا سایہ پڑ ہی گیا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ظالم ابھی تک زندہ ہے۔ تو میں اپنے بیٹے کو کریم نگر ہی نہ جانے دیتی۔ میں اُس کا منہ نوچ لوں گی ——"

دروازے

کے

قریب دیوار کی آڑ میں کھڑے سائے کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے شدت غم سے گلا خشک ہو گیا۔ دل بیٹھنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب گرنے ہی والا ہے۔ اُف! اس کی محبت کا اتنا بُرا انجام! اس کی تمام زندگی کی ریاضت کا یہ ثمرہ!

یہ انعام —— وہ بھی کانٹوں کا! اب ان کانٹوں کا ہار پہنے پہنے ہی اس کا دم نکلے گا۔ مزلہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ کبھی نہیں —— اس نے اتنا ظلم کیا ہے جس کی معافی ممکن ہی نہیں! —— اتنے گناہ کئے ہیں جن کا کوئی کفارہ نہیں! —— انسان تو کیا اسے خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔ اسے اپنی ہی



نہیں اپنے اجداد کے گناہوں کی سزا بھی بھگتنا پڑے گی۔

یہ تو قدرت کا آئین ہے بوتا کوئی ہے اور کاٹتا کوئی ہے۔ جو درخت لگاتا ہے وہی اس کے سائے سے محروم رہتا ہے۔ اسے اپنی روح کھنچتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ آنسو تھے کہ گالوں سے بہہ کر مونچھوں اور داڑھی میں اُلجھ رہے تھے۔

جسم

میں

خنجر سے پیوست ہو رہے تھے جب دل کا درد بڑھنے لگا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیر کانپ رہے ہیں۔ اور وہ اسی جگہ لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔ تو اس نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو کاٹا۔ اپنی ڈوبتی سانسوں کو پوری قوت کے ساتھ مجتمع کیا اور تیزی کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے قدم ایک بار زور سے لڑکھڑائے بھی مگر وہ رکا نہیں سیڑھیاں اُترتے ہوئے بھی مزلہ کی چیخ اس کے خلاف نفرت کی چنگاریاں برساتی ہوئی اس کے کانوں کے پردوں کو جلا رہی تھی۔ یہ نفرت دور تک اس کا تعاقب کرتی گئی۔

جیسے جیسے اس کے قدم آگے بڑھتے گئے وہ اپنی تشنۂ تکمیل زندگی کچلی ہوئی تمناؤں کی لاش اٹھائے مایوسیوں کی دنیا میں کھوتا گیا۔ نفرت اور اس شدت کی نفرت۔ اب اس کی قوت برداشت سے باہر تھی۔

مزلہ بدستور چیخ رہی تھی۔

"اس نے ساری زندگی مجھے تڑپایا ہے۔ میری زندگی جہنم بنادی۔ میرا اور میرے بچے کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ مجھے اس نے کہیں کا نہ رکھا۔ پھر بھی اسے چین نہیں ملا۔ اسی لیے خدا نے اُس کا سب کچھ چھین لیا۔ اور اسی لیے اُس نے مجھ سے اپنی بربادی کا یہ انتقام لیا۔"

"مزلہ بہن! ——"

ندیمہ اس کی نفرت انگیز باتیں سن کر تڑپ اٹھی۔ چیخ کر بولی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ —— اگر انہوں نے یہ سب سن لیا تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا! ——"

"دل! ——"

مزلہ نے نہایت تلخی سے کہا۔

"اس وقت اس کے دل کو کیا ہو گیا تھا جب اس پاپی نے اپنی ہوس کو آسودہ کرنے کے لیے سینکڑوں غریبوں کا خون بہادیا تھا۔ ہزاروں نوخیز کلیوں کو پھول بننے سے پہلے ہی مسل ڈالا تھا۔ اس ظالم کے سینے میں دل بھی ہے جو ٹوٹے۔ آخر اس ظالم نے میرے بیٹے کو مار کر ہی دم لیا۔"

مزلہ

پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"مزلہ بہن! ——"



ندیمہ کا دل پھٹ گیا۔ مزلہ کی باتیں سن سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ اُس نے کہا۔

"زاہد کو انہوں نے نہیں احمد خاں کے دو بیٹے نے مارا ہے جمیلہ کے لڑکے اب تو زاہد کو بچا رہے تھے وہ خود بھی زخمی ہو گئے ——"

"کیا؟ ——"

مزلہ کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ حلق میں سانس ہی اٹک گئی۔

"ہاں! مزلہ بہن! ——"

ندیمہ موقع پاکر بولی۔

"حویلی کے اندر زاہد کو احمد خاں کے آدمیوں سے بچانے کی کوشش میں وہ خود بھی گھائل ہو گئے تھے۔ اور ہسپتال میں بھی اس کی جان بچانے میں انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اگر انہیں زاہد کو مارنا ہوتا تو زاہد کو اپنا خون دینے پر کیوں رضامند ہوتے؟ ——"

"ہاں مزلہ بہن! ——"

دعاً درمیان

میں ڈاکٹر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"نواب ارجمند خود بھی گھائل تھے پھر بھی زاہد کو نئی زندگی دینے کی آرزو میں انہوں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ اگر وقت پر ہمیں ان کا خون نہ ملتا زاہد کی زندگی کی کوئی نہیں تھی۔"

مزلہ کے حساس ذہن کو نہ جانے کتنے جھٹکے لگے۔ زبان تالو سے چپک گئی۔ ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نے سب کی جانب دیکھا۔ اسے اعتبار ہی نہیں ہو رہا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ صحیح ہے۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟

---



یہ سب کیونکر ہو سکتا ہے؟۔ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے
نے کیسے کیسے نفرت آمیز جملے کہہ دیئے تھے۔ یہ اس نے کیا کیا؟ یہ کیا ہو گیا؟ اُف!
ے دل پر ہزاروں آرے چل گئے۔

خاموشی

گہری

خاموشی۔ کمرے میں ہر شخص خاموش تھا۔ صرف ان کی آنکھیں مزلہ کے چہرے
تے جاتے رنگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جہاں غصے اور نفرت کی چنگاریاں اچانک
ودھال میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ جس سے اس کے دل کے جذبات کا پتہ
تھا۔

دفعتاً زاہد کے رخسار ایک بار پھر ایک آہ کے ساتھ وا ہوئے۔

"اباجی ا ۔۔۔۔"

"یہ بے ہوشی میں بہت دیر سے اپنے باپ کو یاد کر رہا ہے ۔۔۔۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ اور زاہد کی جانب دیکھا۔ اچانک ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان کی چمک آگئی۔ وہ بولا۔

"ارے زاہد کو ہوش آرہا ہے۔"

اور پھر وہ سب کو چھوڑ کر مریض کے بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔

وارڈ

میں

سب لوگ مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مزلہ نے پلٹ کر بہت مشتاق نظروں سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھا۔ لیکن اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے انجانے میں اس سے ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا۔ جس کی تلافی وہ جلد سے جلد کر لینا چاہتی تھی۔ اس نے ندیمہ کی جانب دیکھا۔

ندیمہ اپنی بھیگی پلکیں پونچھ رہی تھی۔ اس کا دل مزلہ کے لیے ہمدردی سے بھر گیا تھا۔ اس کے قریب آکر اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بہت پیار سے لیا اور بولی۔

مزلہ بہن ان سے میری باتیں ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اب تک صرف اس لیے زندہ تھے کہ اپنی بربادی کا تماشہ خود اپنی آنکھوں سے



دیکھ لیں نیز تمہیں بھی ان کی بربادی دیکھ کر اطمینان ہو جائے ان کی صرف ایک ہی خواہش ہے تم انہیں معاف کر دو۔ تاکہ ان کی روح کو ابدی سکون حاصل ہو جائے ۔۔۔۔"

جواب

میں

مزلہ کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ دل پر جیسے کسی نے جلتی ہوئی سلاخ رکھ دی تھی۔ جو رگوں کو چیرتی ہوئی اس کی روح کو چھلنی کئے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں رم جھم تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

ایک زندہ لاش کی صورت میں اس نے زاہد اور ندیمہ کو دیکھا۔

"وہ کہاں ہیں؟ ۔۔۔۔"

لرزتی ہوئی آواز سے اس نے پوچھا۔

"بغل کے وارڈ میں ا ۔۔۔۔"

ندیمہ نے جواب دیا۔

"خون دینے کے بعد وہ اور بھی کمزور ہو گئے ہیں ۔۔۔۔"

مزلہ کے دل کو چوٹ لگی۔

دل ہی دل میں اس نے خود کو ملامت کی۔ اُن کے خلاف حقارت آمیز جملے کہتے وقت اس کے ہونٹ کیوں نہ جل گئے۔ انگلیوں سے آنسوؤں کو جذب کرتے

ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی۔ دوبارہ اُس نے زاہد کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے قدم اٹھے اور خود ہی اُسے باہر جانے والے دروازے کی طرف لے گئے۔

جب

وہ

بغل کے وارڈ میں پہنچی تو پلنگ خالی تھا۔ مزلہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کمرہ گہری خاموشی میں محرومیوں اور نامرادیوں کی کوئی تصویر بنا سک رہا تھا۔ وہ پیچھے پلٹی تو ندیہ کو اپنے قریب کھڑے پایا۔

جو ششدر سی کھڑی کمرے میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نظروں کو بھی مایوسی سے دو چار ہونا پڑا۔ اس نے مزلہ کی جانب دیکھا۔ مزلہ کی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔

"میں جانتی ہوں وہ کہاں ہوں گے؟۔۔۔"

کانپتے ہونٹوں سے صبر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مزلہ نے کہا۔

"میں ان کے پاس جاؤں گی۔۔۔۔۔۔۔ ابھی۔۔۔۔۔۔۔ اسی وقت ۔۔۔۔۔۔۔ میں ان سے معافی مانگوں گی۔ انہوں نے جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا ہے بھول جاؤں گی۔ کیونکہ انہوں نے میرے بیٹے کو نئی زندگی دی ہے۔۔۔"

"ابھی؟۔۔۔"



ندیہ نے حیرت سے پوچھا۔۔۔

"ہاں اب۔۔۔"

مزلہ نے عقیدت مندی سے جواب دیا۔

"کریم نگر یہاں سے ہے ہی کتنی دور مجھے یقین ہے زاہد کو اب کوئی خطرہ نہیں اب اس کی زندگی محفوظ ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرنے کو آپ لوگ ہی کافی ہیں۔"

اور

وہ

مزلہ وقت گنوائے بغیر ہی تیزی سے باہر نکل گئی۔

ندیہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ نواب ارجمند سے ملنے کے لیے مزلہ کو تنہائی کی ضرورت تھی، اس لیے اس نے ساتھ جانے سے گریز کیا کریم نگر ہے ہی کتنی دور۔ نواب ارجمند کے ساتھ جلد ہی لوٹ آئے گی۔ نواب ارجمند خود بھی زاہد کو ایسی حالت میں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں سمجھیں گے۔ زاہد کتنا خوش نصیب ہے۔ خوشیاں لایا اپنے لیے ہی نہیں، اپنی ماں، اپنے باپ اور ساتھ ہی ان کے لیے بھی۔

چار

بجے

تھے کہ کار گرد اڑاتی ہوئی کریم نگر کی حد میں داخل ہو کر ٹھیک حویلی کے گیٹ کے سامنے جا کر رکی۔ کچھ فاصلے پر کام کرتے ہوئے مزدوروں نے نظریں اٹھا کر

کار کو دیکھا اور پھر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ آج صبح ہی سے حویلی میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔

واردات سے متعلق پولیس تمام دن تحقیقات کرتی رہی تھی مزدوروں کو سوال جواب سے تنگ کر مارا تھا۔ تعمیر کا کام دیر سے شروع ہوا تھا۔ افسران زاہد کو دیکھنے کے بہانے چھٹی پر چلے گئے تھے۔ صرف چھوٹے عہدیدار ہی کام کرانے کے لیے رہ گئے تھے۔

مزلہ نے

اوپر نظریں اٹھائیں اگرچہ آفتاب غروب ہونے میں ابھی دیر تھی پھر بھی حویلی پر بھیانک پن چھایا ہوا تھا۔ مزلہ نے ڈرائیور کو انتظار کرنے کا حکم دے کر حویلی کا دروازہ کھولا مزلہ شاہدہ کی گاڑی میں یہاں آئی تھی۔ اگرچہ اس کی خواہش نہیں تھی۔ لیکن چونکہ وہ بہت جلدی میں تھی۔ اس لیے ہسپتال سے نکل کر وہ بغیر سوچے سمجھے اس میں جا بیٹھی تھی۔

اس کے بیٹھنے کے بعد ڈرائیور نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا تھا اور اچانک اس کی نظریں گھومتی ہوئی ہسپتال کی بالائی منزل پر جا کر رک گئی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک کھڑکی سے اس کی مالکن ندیمہ مزلہ کو لے جانے کا اشارہ کر رہی تھیں جہاں بھی وہ جانا چاہے۔ اور تبھی مزلہ کے اشارے پر گاڑی پوری رفتار سے چلا کر وہ کریم نگر پہنچ گیا تھا۔



اسے حکم نہ ملتا تب بھی زاہد کی حالت کو مدّنظر رکھتے ہوئے اسے مزلہ کو لے جانا ہی پڑتا۔ لیکن اجازت ملنے کے بعد وہ مطمئن تھا۔

مزلہ حویلی کے اندر داخل ہوئی اور تیزی کے ساتھ برآمدے میں پہنچ کر سیڑھیاں پار کیں۔ بالائی منزل پر پہنچی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

سیڑھیاں اُتر

کر وہ ٹیرس پر آئی جہاں بیٹھ کر نواب ارجمند لوگوں کی فریادیں سنا کرتے تھے۔ وہاں بھی اُسے مایوسی ہوئی۔ پرانی کرسی اپنے فرسودہ مفاد کو پار کر کے آنسو بہا رہی تھی۔ تیزی کے ساتھ وہ حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھی۔

ایک ایک کر کے دیگر تمام حصے جلدی جلدی چھان مارے لیکن ہانپتی سانسوں کے ساتھ اس کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ ان دھڑکنوں پر مایوسیوں کا بوجھ بڑھتا گیا۔ اس کی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔

ٹھنڈ ہوتے ہوئے بھی اس عمر میں دوڑتے دوڑتے وہ پسینے میں تر ہو گئی تھی پھر بھی اس یقین کے ساتھ کہ نواب ارجمند کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ وہ پسینے میں تر ہو گئی تھی۔ مگر اس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ انہیں یہاں ہونا بھی چاہیے ہر حالت میں۔ اس رات بھی اس نے آن ہی کا قہقہہ سنا تھا۔ اور ٹارچ کی روشنی میں چپہ چپہ چھان لینے کے بعد بھی زاہد کو ان کا نشان تک نہ ملا تھا۔ اس وقت بھی اسے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

جیسے وہ یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔ یکایک بڑے ہال کے سامنے کے دروازے پر تالا دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اس رات جب اس نے قہقہے کی آواز سنی تھی تب بھی تو اس پر قفل پڑا تھا۔ وہ اور زیادہ صبر نہ کر سکی۔

پہلو کے زینے سے اوپر چڑھتے ہوئے وہ شیشے کی ایک کھڑکی کے پاس سے گذری جس کے پٹ اندر سے بند تھے۔ اس نے ایک بڑی سی اینٹ لے کر اس پر دے ماری ایک چھناٹے کی آواز کے ساتھ شیشہ پاش پاش ہو گیا۔

بڑھ کر اس نے اندر ہاتھ ڈالا۔ تو کلائی کٹ گئی۔ زخم خوردہ مقام سے خون بہنے لگا۔ کھڑکی کھلتے ہی گرد کا غبار سا اٹھا اور ڈوبتے سورج کی جھانکتی ہوئی کرن سے ہم آغوش ہو کر ایک موٹی لکیر کی صورت میں ایستادہ ہو گیا۔

وہ

اندر

کود دی تو کمرے میں کرنوں کی روشنی کافی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا حویلی کے پرانے گلے پھٹے بڑے بڑے فرنیچر پر برسوں کی دھول جمی ہوئی تھی۔ فرش کی موٹی قالین پر گرد کی اتنی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی کہ اس کے قدموں کے نشان بنتے چلے گئے۔

اس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔

شاید......... شاید وہ یہیں کہیں مل جائیں۔ لیکن بھاری بھاری



زنجیر کے علاوہ یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چور ڈاکو اٹھا لے جانے کے قابل ساری اشیاء پہلے ہی لے جا چکے ہیں ——

---

وہاں بڑے بڑے چاندی کے گلدان تھے۔ وہاں سونے کا ترازو تھا۔ اور وہاں ایک بڑی شاہی کرسی تھی۔ جس پر سونے کی پٹی چڑھی ہوئی تھی اور اس جگہ دیوار پر ایک بہت خوبصورت تصویر تھی۔ وہ تصویر جس نے اتنا ظلم سہنے کے بعد بھی اُس کے اندر زندہ رہنے کی طاقت پیدا کر دی تھی۔

اور

جسے

اُس نے کچھ ہی دن پہلے شاہدہ کے گھر میں بھی دیکھا تھا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ نواب ارجمند نے سب چیزیں بیچ ڈالی ہوں گی۔ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی۔ جب اُس نے بددعا دی تھی جو نواب ارجمند کی تباہی کا موجب بنی، کوئی اچھی بات کہی ہوتی تو کبھی پوری نہ ہوتی۔



دفعتاً اسے یاد آیا اسی کمرے کے دروازے سے وہ ایک بار رنگ محل میں بھی اخل ہوئی تھی۔ جہاں ایک اونچا چبوترہ تھا۔ اور جہاں شاہی کرسی پر نواب ارجمند ٹھا کرتے تھے ٹھیک اس سے پیچھے پتھر کا ایک دروازہ بھی تھا۔

قریب

ہی

ایک کل پر نظر پڑتے ہی اُس نے اُسے پوری طاقت سے گھمایا۔ دروازہ فوراً ل گیا۔ سورج کی روشنی کا عکس اندر تک پہنچ رہا تھا۔ اندر کا ماحول ہلکی سی ندلاہٹ میں لپٹا ہوا تھا۔ خاموشی ——— بالکل خاموشی ——— ایسا محسوس ا تھا گویا اندھیرے میں فرش پر جنات ٹہل رہے ہوں۔ یا سفید پریاں رقص ی ہوں۔

وف سے اس کا دل کانپ گیا۔ لیکن اس نے ہمت سے کام لیا۔ لپک کر رے میں آئی کھڑکی کے قریب ایک موٹی موم بتی لڑھکی پڑی تھی ماچس کی تیلیاں ری پڑی تھیں۔ چند نیم جلے سگار کے ٹکڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اس نے موم بتی ائی تیلی اٹھا کر ماچس کے بکس پر رگڑی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔

جلتی ہوئی موم بتی کی رہنمائی میں وہ سیڑھیاں اتر کر رنگ محل میں داخل ہو گئی ے محسوس ہوا جیسے انگنت آنکھیں اُس پر لگی ہوئی ہیں۔ اُسے گھور رہی ، نہ جانے کیوں؟ شاید یہ اُس کا واہمہ ہو۔ شاید نواب ارجمند کی آنکھیں ہی

اسے گھور رہی ہوں۔ لیکن جب دل سخت کر کے وہ اندر پہنچی تو نظریں ٹھٹھک کر پتھرا گئیں۔

کتنی ہی

تصویریں

ایک قطار میں دیوار پر لگی اس کا استقبال کر رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا۔ کہ اس کی دھڑکنوں کے ساتھ۔ تصویروں کا دل بھی دھڑکنے لگا ہے۔ بند ہونٹوں کے پیچھے تصویروں کی زبانیں چیخ رہی ہیں۔ چیخ چیخ کر قہقہے لگا رہی ہیں۔ اس کی بدقسمتی پر۔ اس کے غرور کا تمسخر اڑا رہی ہیں۔ ہنسی اڑا رہی ہیں۔ گاؤں کی ایک معمولی لڑکی کی ایک نواب سے نفرت —— ایسی نفرت کہ وہ اسے کبھی معاف نہ کر سکی۔

آخر کس غرور کے نشے میں سرشار ہو کر؟ کس بات کا غرور ہے اُسے؟ دیواروں پر بڑے بڑے آئینے آویزاں تھے۔ ان کی چمک میں شمع کی روشنی سے ارتعاش سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ان کی چمک میں تصویریں انسان پیکر میں منعکس ہو کر تھرکتے ہوئے زبانِ حال سے اپنی کہانی دہرا رہی تھیں۔

رو رو کر گا گا کر۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کی تال۔ وہ تصویروں کے اور قریب چلی آئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں گھورنے لگی۔ کان لگا کر ان کی بے زبان داستان سننے لگی —— یہ کیا؟ ........ یہ تصویریں! —— یہاں ——



یہاں یہ تصویریں کیسے آئیں؟ —— یہ تصویریں تو اس کے بابا نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔

تقریباً

بائیس

برس پہلے۔ ان تصویروں کے انگ انگ سے وہ واقف ہے۔ پھر بھی اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہو رہا تھا۔ ان تصویروں کو ان کے بابا نے ایک بہت بڑے سوداگر کے ہاتھ بیچا تھا۔ بہت مہنگے داموں پر وہ تو ان تصویروں کی اور بھی زیادہ قیمت دینا چاہتا تھا۔ لیکن بابا نے منع کر دیا تھا —— ہاں —— کیا نام تھا اُس کا؟ —— یاد آیا۔ سلمان —— ہاں —— سلمان ہی اس سوداگر کا نام تھا۔

یہ تصویریں یہاں کس طرح آئیں اور وہ سوداگر کون تھا؟ کون تھا وہ جس کے چہرے پر ہمیشہ ایک موٹا چشمہ چڑھا رہتا تھا۔ جس کی گھنی مونچھوں اور داڑھی کے پیچھے ایک جانی پہچانی سی صورت کا گمان ہوتا تھا۔

سنجیدہ!

کچھ کھوئی کھوئی سی صورت!! ——

کون تھا وہ دردمند جو ہر روز اس کے ہاں آنے کا آرزومند رہتا تھا۔؟ جو اس سے باتیں کرتے کرتے کھو جاتا تھا۔ اُس کے بچے کو اس قدر پیار کرتا تھا کہ کبھی

کبھی وہ خود بھی اس کی وجہ معلوم کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ کیوں اُسے دیکھتے دیکھتے اچانک ہی اُس سوداگر کا چہرہ اُداس ہو جاتا تھا۔

مزلہ

کا

دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

جسم کسی انجانے خوف سے کانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ شمع اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے گی۔ اندھیرا چھا جائے گا۔ اور وہ اس اندھیرے میں سدا کے لیے ڈوب جائے گی۔ اس کی رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا۔

اسے اتنا بھی ہوش نہیں رہا کہ شمع پگھل کر اس کی انگلیوں کو جلا رہی ہے انگلیوں پر آبلے پڑتے جا رہے ہیں۔ اس نے تصویروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک کنارے سے ہو کر وہ ایک ایک کر کے سب تصویریں دیکھنے لگی۔

یہ شائستہ کی کہانی ہے۔ یہ شائستہ کی بڑی بہن انوری ہے جسے شادی کے بعد بھی نواب ارجمند نے عشق ستم بنایا تھا۔ یہ رجو ہے جو نواب کی ہوس کو آسودہ کرنے کے بعد دولت کا معاوضہ قبول کرنے کے لیے اس لیے مجبور ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسے اپنی چھوٹی بہن کی شادی کرنا تھی۔

لیکن شادی سے قبل ہی گاؤں کے چودھری نے اسے اُٹھوا کر انعام کے لالچ میں نواب ارجمند کو پیش کر دیا تھا۔ یہ سب ہے اس کی چھوٹی بہن ننھی سی کلی



جو ابھی چٹکی بھی نہیں تھی کہ بھنورے نے اس کی ایک ایک پنکھڑی کا رس نچوڑ لیا۔

اپنی

بہن

کی تصویر دیکھ کر اس کی آنکھوں کا رکا آبشار پھر جاری ہو گیا۔ لیکن اس بار وہ نواب ارجمند سے نفرت نہ کر سکی۔ بلکہ اس ظالم کے لیے اس کی چاہ بڑھتی ہی گئی جس نے گاؤں کی دوشیزاؤں ہی کو نہیں۔ اس کی بہن ہی کو نہیں۔ بلکہ خود اس کی عصمت کو بھی لوٹا تھا۔

شمع ہاتھ میں لیے وہ آگے بڑھی۔ جس کی مرتعش لو میں اس کا سنجیدہ چہرہ خود بھی ان تصویروں کا ایک حصہ دکھائی پڑتا تھا۔ معاً وہ چونک پڑی ارے یہ تصویر۔ . . . . . . . . یہ تصویر کہاں سے آ گئی۔

یہ تصویر تو بابا نے خادر جوزف کو بطور تحفہ دی تھی۔ پھر یہ یہاں کیسے آ گئی؟ خیالات کی کڑیوں میں وہ اس طرح الجھتی جا رہی تھی کہ کسی ایک سوال پر گہرائی سے سوچ کر حل نکالنے سے قاصر تھی۔ آخر یہ کیا پہیلی ہے۔؟

اچانک دوسری تصویروں کے قدموں میں پڑی ہوئی کسی شے کی جگمگاہٹ نے اس کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لی۔

دو دو قدم آگے بڑھ کر اس کے نزدیک آئی۔ ایک تصویر کے قدموں پر انگنت گھنے بکھرے پڑے تھے۔

شمع

ایک

طرف رکھ کر اُس نے اُنہیں اُٹھالیا۔

چاندی کے گہنے۔ ٹیکہ کانوں کے بڑے بڑے جھومر۔ گلے کا ہار۔ کنگن۔ کچھ چھلّے۔ کردھنی پائل ایک ہی نظر میں اس نے ان زیورات کو پہچان لیا۔

پہچانتی بھی کیوں نہ؟ یہ تو اُس کے حسن کی آرائش تھے۔ اس کی دوشیزگی کے ماہ و انجم آج سے تقریباً بائیس سال پہلے جب ہاتھوں میں مہندی لگا کر اور آنکھوں میں کاجل بھر کر اُس نے ان گہنوں کو پہنا تھا۔ تو گاؤں کی سب ہی جوان اور بوڑھی عورتیں اسے دیکھنے اُمڈ پڑی تھیں۔

گاؤں کے جوان بھولا کی قسمت پر رشک کر اٹھے تھے۔ اس دن ان زیورات کی چمک دمک کچھ کم نہ تھی۔ تاہم اس کے حسن کی تابندگی کے مقابلے میں ان کو جگمگاہٹ ماند پڑ گئی تھی۔

یکایک اسے یاد آیا۔

ان گہنوں میں اس کی ایک انگوٹھی نہیں تھی۔ وہ انگوٹھی نہیں تھی۔ جس پر مزلہ لکھا ہوا تھا۔ وہ سسک پڑی۔ سسکتے ہوئے اُس نے ان گہنوں کو چوم لیا۔

ضبط نہ ہوا تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ان گہنوں کو اس نے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کے آنسو ان کی چمک کو دھو کر انہیں از سر نو تازگی بخشنے کی سعی



کرنے لگے۔ اور وہ دیکھ رہی تھی۔ صاف........ اپنی زندگی کی کتاب کے ورق بائیس سال پہلے کی تحریر کو نواب ارجمند کہہ رہے تھے۔

"یہ انگوٹھی اُسی وقت میری انگلی سے اُترے گی جب تم مجھے معاف کر دو گی اور اسے دوبارہ قبول کر کے اپنی انگلی میں پہن لو گی۔ تو میں سمجھوں گا کہ تمہارے دل میں میرے لیے پیار کا ایک مقام بن گیا ہے۔ بائیں ہاتھ کی انگلی میں نے اسی لیے پہنا ہے کیونکہ یہی میرا دائیاں ہاتھ ہے۔ اسی ہاتھ سے سب کام کرتا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے اسے یہ مقام دینے کی۔ تمہارے باقی زیورات میرے پاس محفوظ ہیں۔ میرے نزدیک وہ زیورات ایک مقدس امانت ہیں ا۔۔"

مقدس

امانت

مزلہ کی بھیگی پلکیں سامنے رکھی ہوئی تصویر کی جانب اٹھ گیئں۔ جس کے قدموں میں یہ زیورات پڑے تھے۔ اس کے دل پر آرے چل گئے۔ یہ تصویر اُس کی زندگی کی کہانی کی ترجمانی کر رہی تھی۔

مزلہ

نے

تصویر کو اٹھالیا۔ اور اسے پر شوق نظروں سے دیکھا۔ ہر زاویے سے ں کی نوک پلک پر کھے ـــــ اور پھر اس پر اپنی پیشانی دے ماری۔ خون کی

دھار اُسی جگہ سے بہہ نکلی۔ جہاں تقریباً بائیس سال پہلے ایک زخم نے اپنا داغ نشان چھوڑ دیا تھا۔ اپنے دل کو سکون دینے کے لیے وہ اب بھی اس حقیقت پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی ——

---



مگر وہ سب کچھ حقیقی منظر تھا۔ وہ حقیقت کو جھٹلا نہ سکتی تھی۔ اُس نے آنسو پونچھے۔ تصویر کو وہیں رکھا۔ گہنے اُس کے قدموں میں پھینکے۔ اور ہر چیز پر حسرت بھری نظر ڈالتی ہوئی وہ آگے بڑھی۔ شمع کو وہیں سیڑھیوں پر رکھا۔ اور باہر آگئی کار میں بیٹھ کر اُس نے ڈرائیور سے کہا۔

"سبحان پور چلو! ——"

"سبحان پور! ——"

ڈرائیور نے وقت کا اندازہ لگا کر اندر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! —— ذرا جلدی چلو! ——"

مزلہ نے بے استقلالی کے انداز میں کہا۔ اور گردن گھما کر حویلی پر نظر ڈالی۔ کار تیزی سے آگے بڑھی اور کریم نگر کے علاقے کو چھوڑتی چلی گئی۔

سبحان پور

سے

تقریباً دو میل قبل مشن ہسپتال کے لیے جب مزلہ کی کار گذری تو برگد کا ایک بڑا درخت دیکھ کر مزلہ کو اچانک ہی کچھ یاد آگیا۔ یہاں اسی درخت کے قریب وہ ایک گدھے کی پیٹھ پر بیٹھ کر آگے بڑھی تھی۔ اور لڑھک کر کیچڑ میں لت پت ہو گئی تھی۔ حالانکہ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔

اور

سورج

غروب ہوئے بھی دیر ہو چکی تھی۔ پھر بھی ایک ہی نظر میں وہ اس دیوہیکل درخت کو پہچان گئی۔ پہچان اس لیے گئی کیونکہ اس کے دو موٹے تنے ایک دوسرے کو ہم آغوش کئے ہوئے جڑ سے شروع ہو کر اوپر تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس وقت

اندھیرے کا غبار اس کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام تھا۔ پھر اُس نے غور کیا یہاں تو وہ ٹھہری تھی۔ جہاں اُس نے اپنے بچے کو بے کسی کی حالت میں جنم دیا تھا۔ وہ حیران تھی۔ اب اُسی جگہ ایک بہت بڑے ہسپتال کی عمارت تھی۔



وہ کار رکوا کر نیچے اتری۔

اُس نے ایک شخص سے پوچھا۔

”یہ ہسپتال کب بنا تھا؟ ــــ“

اُس آدمی نے اُسے حیرت سے دیکھا پھر بولا۔

”کافی عرصہ ہو گیا؟ ــــــــ برسوں گذر گئے!! ــــ“

”کس نے بنوایا تھا یہ ہسپتال؟ ــــ“

”مزلہ بی بی نے!! ــــ“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں! ــــــــ“

”کون مزلہ بی بی ہیں یہ؟ ــــ“

”نواب ارجمند کی کوئی قریبی عزیز ہیں۔“

اُس شخص نے اُسے تعجب سے دیکھ کر جواب دیا۔

”نواب ارجمند کا کہنا تھا کہ ان کے بیٹے نے اس مقام پر جنم لیا تھا۔ اسی لیے اُنہوں نے اس مقام پر یہ ہسپتال بنوا دیا۔“

مزلہ

مبہوت

ہو کر رہ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کے جسم کے خون کی ایک ایک بوند اندر ہی اندر منجمد ہو کر برف کی سل میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اتنی بڑی عزت، اتنا بلند مرتبہ ——

اس کا دل بے طرح تڑپ اٹھا۔ جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

وہ تو ایسی عزت کے لائق بھی نہ تھی۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا —— ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ اس قابل نہیں ہے۔ اس کی نفرت کا یہ حاصل ہے۔ تو اس کے پیار کا کیا حاصل ہوتا۔

کاش اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ان سے پیار کیا ہوتا۔ کاش! اس کی سسکیاں ہونٹوں پر ابھر آئیں۔ پھر اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور آنسو پونچھ کر پلٹی اور کار میں آکر بیٹھ گئی۔

"مشن ہسپتال چلو! —— جلدی! ——"

ڈرائیور نے چابی گھما کر گاڑی اسٹارٹ کر دی ایکسیلیٹر پر پیر دبایا تو گاڑی پوری رفتار میں آنے سے قبل ہی ہسپتال کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

گیٹ

کھول

کر وہ باہر نکلی تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی دوسرے ہسپتال میں چلی آئی ہو۔ نگاہیں اٹھا کر اس نے چاروں طرف دیکھا ہسپتال پہلے سے زیادہ طویل تھا۔ کافی صاف ستھرا عقبی حصے کی اونچی عمارت بھی اب ہسپتال کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ ہسپتال کے اندر پہنچتے پہنچتے اسے



کچھ یاد آیا۔ پلٹ کر واپس آئی —— ہاتھ ڈال کر اس نے کار کی پچھلی سیٹ سے خداوند یسوع مسیح کی تصویر اٹھائی اور ہانپتی ہوئی پھر ہسپتال کے اندر پہنچ گئی۔

ابھی

وہ

ادھر ادھر دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک اسے ایک نرس مل گئی۔

"نرس! ——"

اس کے نزدیک جا کر اس نے پوچھا۔

"یہاں فادر جوزف کہاں ملیں گے؟ ——"

"وہ تو ریٹائرڈ ہو گئے! ——"

"ریٹائرڈ ہو گئے؟ ——"

"ہاں آں! ——"

نرس نے اثبات میں کہا۔

"کل صبح کے جہاز سے وہ اپنے ملک واپس جا رہے ہیں! ——"

"کل صبح کے جہاز سے! ——"

نزلہ کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔

"اس وقت وہ کہاں سے مل سکتے ہیں؟ ——"

"اس وقت وہ خاور فرانسس کے بنگلے پر ہیں ۔۔۔ آج ان کا فیرویل ڈنر جو ہے۔ خیر ویل پارٹی تو شام کو یہاں پر بھی تھی اگر آپ شام کے وقت آجاتیں تو یہیں ملاقات ہو سکتی تھی۔"

"خاور فرانسس کے بنگلے پر ۔۔۔"

مزلہ

نے

یاد کرنے کی سعی کی خاور فرانسس کی عنایتوں کو بھی وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ "کیا یہ وہی فرانسس تو نہیں جو پہلے لاہور میں اسی مشن کے انچارج تھے ۔۔۔"

"یہ تو آپ بہت پرانی باتیں کر رہی ہیں۔"

نرس نے کہا۔

"اب تو وہ یہاں کا کام سنبھال چکے ہیں ۔۔۔"

"یہاں کا ۔۔۔"

مزلہ کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔

"کیا وہ یہیں خدمت گذاری کا کام کر رہے ہیں ؟ ۔۔۔ کیا ان کا بنگلہ یہیں پر ہے۔ جہاں آج خاور جوزف کا فیرویل ڈنر ہو رہا ہے ؟ ۔۔۔"

"جی ہاں ۔۔۔"



نرس اُس کی باتوں سے اکتا چلی تھی۔ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو مزلہ سمجھ گئی اسے کہیں جانا ہے۔

---

خاور جوزف کے ساتھ ہی خاور فرانسس بھی کھڑے تھے۔ جنہیں وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی۔ وہ بھی کس درجہ بدل چکے تھے۔

اچانک

خاور فرانسس

کی نظر اس پر پڑی تو وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھے چشمے کے پیچھے سے انہوں نے مزلہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"آپ!.........."

انہوں نے کہنا چاہا ـــــ

"میں مزلہ ہوں ـــ زاہد کی ماں!ـــ"

مزلہ نے برجستہ کہا۔



مزلہ؟ یہ نام خاور جوزف کے کانوں تک پہنچا تو وہ ٹھٹک گئے۔ چشمے کے اندر سے انہوں نے بھی مزلہ کو بہت غور سے دیکھا۔ اور بڑھ کر اُس کے نزدیک جا کھڑے ہوئے۔

"آپ مزلہ بی بی ہیں!ـــ"

فرطِ مسرت سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جی ہاں خاور میں مزلہ ہوں!ـــ"

جانے کس جذبے کے تحت مزلہ کی آواز بھی کانپنے لگی۔ لیکن اس نے بات جاری رکھی۔

"وہی مزلہ جسے کیچڑ سے اُٹھا کر آپ نے نئی زندگی بخشی تھی۔ جس کے بچے کو آپ نے آسمان کا تارا بنا دیا۔"

"نہیں ـــ نہیں مزلہ بیٹی!ـــ ایسی بات نہیں!ـــ"

خاور جوزف بولے

"ایسا لگتا ہے۔ نواب ارجمند نے تمہیں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ وہ بھی ساتھ آئے ہیں کیا؟ـــ"

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ان سے ملے تو ایک مدت بیت گئی خاور!ـــ"

مزلہ کے ہونٹوں سے یاس بھری آہ نکل گئی۔ بولی۔

"اسی لیے تو میں ایک مرتبہ راز جان کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتی ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے بیٹی جو تمہاری مدد کروں ـــ"

خاور جوزف نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ نواب ارجمند سے اب تک تمہاری ملاقات نہیں ہوئی۔"

وہ یقین ہی نہیں کر سکے۔

"انہیں دیکھے تو ایک زمانہ گذر گیا خاور!"

مزلہ کی آواز بھیگ گئی۔ لیکن دوسرے لوگوں کی موجودگی کا خیال کر کے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بولی

"صرف اتنا بتا دیجیے! خاور! کہ یہ تصویر بابا سے لینے کے بعد آپ نے کسے دی تھی؟ ـــ"

خاور جوزف

نے

تصویر ہاتھ میں لی خداوند یسوع مسیح کی تصویر۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ پہچانتے بھی کیوں نہیں؟ یہ تصویر تو انہوں نے بڑے آدمی کو بطور تحفہ دے دی تھی جس نے بغیر کسی ذاتی مفاد صرف اپنی محبت کی خاطر پوری ایک کوٹھی ان کے ہسپتال کو دے دی تھی۔

"یہ تصویر میں نے نواب ارجمند کو دی تھی ـــ"



خاور جوزف نے کہا۔

"کیونکہ انہوں نے خود ہی اس کی درخواست کی تھی۔ دنیا کی ہر وہ شے جس ،تمہاری ذات کو وابستگی تھی۔ وہ لے کر اپنے پاس محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ ی نہیں انہوں نے اپنے پیار کی خاطر ہسپتال کے قریب والی کوٹھی بھی ال کو عطیے میں دے دی تھی۔ پھر بھلا میں انہیں یہ تصویر دینے سے کیسے ار کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ تمہاری ہی تلاش میں یہاں آئے ، تم سے معافی مانگنا چاہتے تھے۔ لیکن مزلہ! ـــ"

انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم ان سے ملی کیوں نہیں انہیں معاف کیوں نہیں کیا؟ تمہاری خوشنودی یے انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔"

"کیا کچھ چھوڑ دیا خاور! ـــ"

مزلہ نے ہر بات کا صحیح اندازہ لگانے کے بعد بھی پوچھا۔ کبھی کبھی آدمی کو قت کا علم ہو جانے کے بعد بھی وہمی بن جاتا ہے۔ اور اپنے دل کے ہے سے وہم کو دور کر کے پوری تسکین حاصل کر لینا چاہتا ہے۔

"تمہاری خوشی تمہارے سکھ اور آرام کے لیے انہوں نے کہا کہ وہ تمہارے کی ساری تصویریں خرید لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کر کے کیا وں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا آرام اور خوشی تمہارے لیے قربان

کردی!۔۔۔۔"

مزلہ مبہوت ہو کر رہ گئی اس امر سے متعلق بھی اس کا اندازہ صحیح نکلا۔

"تمہارے بچے کے لیے انہوں نے نرسری سے لے کر سینٹ کیمرج تک ایسے فنڈ کھول دیئے۔ جن سے اسے اسکالرشپ دستیاب ہوتا رہے۔"

دفعتاً

بیچ

میں خاور فرانسس نے کہا۔

"یہی نہیں بلکہ تمہیں یاد ہو گا کہ تمہارے کہنے پر ہم نے ایک بدمعاش کی رپورٹ پولیس میں کئی بار کی تھی لیکن اس کے باوجود کوئی اسے روکنے کی جسارت نہیں کر سکا تھا۔ جب نواب ارجمند کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً اثر ڈال کر اسے سزا تک کرا دی تھی۔ صرف تمہارے آرام کے لیے انہوں نے وہ سڑک بھی بنوا دی جو تمہارے کوارٹر کے پیچھے سے گذرتی تھی۔"

"آہ!۔۔۔"

مزلہ کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت زدہ سی کھڑی وہ اس حقیقت کو ٹھوس دیکھ کر بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس درجہ پیار!۔ اتنی عظیم ریاضت! ان کے گناہوں کی تلافی تو کبھی کی ہو چکی ہے اب تو وہ ثواب کما رہے ہیں۔



یہ اُس نے اُن پر کیا غضب ڈھا دیا۔ اتنی سخت بے انصافی! اس درجہ ظلم!! جو ظلم انہوں نے تجھ پر نہیں کیا۔ وہ اُن پر کیئے جا رہی ہے۔

"لیکن خاور!۔۔۔"

کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"آپ نے یہ سب باتیں مجھے پہلے کیوں نہیں بتائیں؟۔۔۔"

"مزلہ بیٹی!۔۔۔"

خاور جوزف نے جواب دیا۔

"میں اور خاور فرانسس جب بھی ملے اکثر دونوں کے متعلق ہی باتیں کرتے تھے۔ کئی بار خواہش ہوئی کہ تمہیں ان باتوں سے روشناس کرا دیں۔ لیکن یہ سوچ کر ہم خاموش رہ جاتے کہ کہیں نواب ارجمند کی ساری محنت پر پانی نہ پھر جائے انہوں نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ تمہیں ان باتوں کا قطعی علم نہیں ہونا چاہیئے! یہ سب انہوں نے تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے! ہم نے نہیں۔ جس کے بھرم میں تم اب تک ڈوبی ہوئی تھیں دراصل وہ تمہیں اپنے احسانوں سے نہیں اپنے پیار سے جیتنا چاہتے تھے۔"

"اوہ!۔۔۔"

مزلہ کے منہ سے نکلا دل پر نشتر چبھ رہے تھے۔ زخم اور گہرا ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ یہ زمین پھٹ جائے آسمان اُس کے سر پر ٹوٹ پڑے۔

"اچھا بیٹی ! اور بھی کچھ پوچھنا ہو تو پوچھ لو۔"

خاور جوزف نے کہا۔

"کیونکہ کل صبح میں اپنے ملک چلا جاؤں گا۔ بینتیس سال تک انسانی خدمت کرنے کے بعد اب کچھ دن اپنے گھر بھی رہنا چاہتا ہوں جہاں میرے بھائی بہن ہیں۔ اس عمر میں بھی میرے والدین میری آمد کے منتظر ہیں ــــ"

خاور جوزف نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"کچھ نہیں خاور کچھ نہیں !ــــ"

مزلہ کا گلا بھر آیا آواز نم ہو گئی مشکل سے اپنی ہچکی پر قابو پانے کے بعد بولی

"کچھ نہیں ۔ اس سے زیادہ پیار کا بار میں برداشت نہ کر سکوں گی ــــ"

"یہ تصویر تمہاری طرف سے میں لے جاؤں۔"

خاور جوزف نے خداوند یسوع مسیح کی تصویر کو اپنی نظروں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

اور مزلہ

نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں !" کے اشارے پر سر ہلا دیا ایسا کرتے وقت اُس کی آنکھوں کے آنسو رخساروں تک چلے آئے تھے۔ اپنے مہربان کی وہ کسی چیز کو کسی کو بھی دینا نہ چاہتی تھی۔ مگر خاور جوزف کو وہ انکار نہ کر سکی۔

"جاؤ بیٹی ! نواب ارجمند کو اپنا لو !"



آخر کار خاور فرانسس نے کہا۔

"وہ سچ مچ تمہیں بہت پیار کرتے ہیں !ــــ"

"جی خاور.......... جی .......... !ــــ"

مزلہ سسک کر بولی اور پلٹ کر آہستہ قدموں سے باہر نکل گئی۔ اس نے دیکھا ابھی بہت سارے لوگ خاور جوزف سے ملاقات کرنے کے منتظر تھے۔

دور بہت

دور ایک پہاڑی علاقے کی خاموش شام !

صرف فضا میں ایک سنساہٹ تھی جو کبھی کبھی اس خاموشی کو توڑ کر ہواؤں کے ساز پر سرگوشی کر جاتی تھی۔ سیاہ بادلوں کا ڈیرہ تھا اور بدگمان ہوتا تھا جیسے آج سورج اپنے وقت سے پہلے ہی غروب ہو گیا ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں کالے بادلوں کی دبیز پرتوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے آفتاب کے لبوں کی سرخی جھانکتی دکھائی پڑ جاتی تھی ــــ اور اس علاقے کے ایک الگ تھلگ پہاڑی پر ایستادہ سینیٹوریم کی عمارت کے ایک وارڈ میں چارپائی پر لیٹا ٹی بی کا مریض ایک بوڑھا اور نحیف مریض بہت خاموشی سے اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔

وہ کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتا تھا۔ کبھی اٹھتا تھا کبھی بیٹھ جاتا تھا اُس کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے سنگ مرمر کی

ایک پلیٹ آویزاں تھی۔ لکھا تھا۔

اس سنگِ مرمر کو نواب ارجمند کے بے پناہ خلوص
اور نوازشوں کی یادگار میں آویزاں کیا گیا ہے۔ اگر
اس سینیٹوریم کی زندگی میں اُن کا تعاون نہ ہوتا تو یقیناً
اسے مالی ابتری کی وجہ سے بند کر دیا جاتا۔۔۔

اب سے تقریباً پندرہ سال پہلے جب کچھ دن کے لیے نواب ارجمند اپنے دل کی سلگتی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس پہاڑی علاقے میں بھٹک آئے تھے تو ان کی موجودگی کا علم ہونے پر یہاں کے کارکنوں نے ان کے اعزاز میں ایک چارپائی دی تھی اور ان سے اچھی خاصی رقم وصول کر لی تھی۔ آج انہیں کوئی نہیں جانتا تھا کوئی نہیں پہچانتا تھا۔

آج بھی وہی ڈاکٹر تھا جس نے اعلانیہ ان سے بھیک مانگی تھی۔ چند نرسیں اور سسٹرز وہی تھیں۔ لیکن نواب ارجمند اب نواب نہیں تھے۔ ایک عام مریض تھے ٹی بی کے مریض۔ جیسے کسی نے ترس کھا کر سڑک پر سے اٹھا کر یہاں بھرتی کرا دیا تھا۔ محبت نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پاگل۔ دیوانہ۔ اور محبت تھی ابھی تک ناکام تھی۔ مزلہ انہیں ابھی تک معاف نہ کر سکی تھی۔۔۔



سینیٹوریم میں داخل ہونے سے پیشتر انہوں نے اپنا اسٹیٹ بینک میں جمع کیا ہوا سارا روپیہ زاہد کے نام کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تمام متعلقہ کاغذات بھی اسے ملتان بھیج دیئے تھے اپنے لیے انہوں نے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ رکھ کر کرتے بھی کیا۔ جینے کی آس ہی ختم ہو چکی تھی۔

زندگی

کوئی

اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس دنیا سے وہ اکتا چکے تھے۔ قدرت کے فیصلے سے انہیں کوئی لگاؤ نہ رہ گیا تھا۔ دل کو یہ کہہ کر تسکین دے دی تھی کہ وہ اپنے کیے کا انجام بھگت رہے ہیں۔ گناہوں کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ ان کے گناہوں کا کفارہ اب مر کر ہی پورا ہو گا۔

سینیٹوریم میں پڑے پڑے انہیں کافی دن ہو چکے تھے اور جوں جوں

ان کا علاج ہوتا گیا صحت اور بھی خراب ہو گئی۔ پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھتے بھی تو ہانپنے لگتے تھے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے تو رک رک کر جیسے زبان لڑکھڑا رہی ہو بات کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے دل بیٹھ جائے گا۔ اور تب وہ بہت بےچینی سے اپنا دم نکلنے کا انتظار کرنے لگتے ـــــ اُنہوں نے مزلہ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ مگر انہیں کیا ملا تھا۔ دکھ ، تباہیاں، اداسیاں اور نہ ختم ہونے والی بیماری ـــــ !

مقررہ وقت پر ایک نرس ان کے پاس آئی اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ پرانے اخبار میں لپٹا ہوا۔ جسے لاپرواہی سے پلنگ کے قریب پڑی ہوئی ایک میز پر رکھ دیا۔ چارٹ پڑھا اور انجکشن تیار کرتے ہوئے بولی۔

"بابا تم اتنا خاموش کیوں رہتے ہو؟ ـــــ"

لیکن مریض

نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش ہی رہا اچانک اس کی نگاہ پیکٹ کے اخبار پر پڑی جس میں جلی حروف میں اُسی کا نام لکھا تھا۔ اُس نے فوراً وہ پیکٹ اُٹھا لیا اور پڑھا مزلہ نے انہیں نواب ارجمند خاں کے نام سے مخاطب کرنے کے بعد دست بستہ معافی مانگتے ہوئے منت کی تھی کہ وہ جلد از جلد گھر لوٹ آئیں۔

معاً مریض کے چہرے پر ایک چمک نمودار ہوئی۔ بالکل اس طرح جس



طرح ایک بجھتا ہوا چراغ دم توڑنے سے پیشتر ایک بار چمک اُٹھتا ہے فرطِ مسرت سے اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔ لب تھرتھرا اٹھے۔ مزلہ نے انہیں معاف کر دیا۔ مزلہ نے انہیں معاف کر دیا۔ وہ خود نواب ارجمند خاں سے معافی کی طلب گار ہے۔ انہیں پیار کرتی ہے۔ ان کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ انہیں بلا رہی ہے۔ فوراً بلا رہی ہے۔ مریض کو اپنے اندر ایک عجیب وغریب طاقت کا احساس ہوا۔ اس اچانک خوشی سے وہ دیوانہ سا ہوا جا رہا تھا۔

دفعتاً

وہ بہت زور سے چیخ پڑا۔

"مزلہ ا ـــــ"

اس کی آواز جیسے سینیٹوریم کے گوشے گوشے میں گونج گئی۔ وارڈ میں سوتے جاگتے مریض بھی چونک گئے۔ نرس انجکشن تیار کر رہی تھی اس اچانک چیخ پر اس کا بھی کلیجہ کانپ گیا۔

"اوئی ا ـــــ"

اس کے لبوں سے نکلا سرنج ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گری۔ اس نے گھور کر مریض کو دیکھا۔

"مزلہ ا ـــــ"

مریض پھر چیخا۔ اس بار پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخا۔ پھر اس

کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ نرس نے گھبرائے گھبرائے انداز میں اُسے انجکشن لگایا۔ اور اپنا پیکٹ اُٹھا لیا۔ جو کھانستے وقت نواب کے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔

نرس کے جانے کے بعد اُس نے مناسب موقع دیکھا وہ اُٹھا اور لرزتے قدموں سے باہر آیا۔ کافی سردی تھی۔ اُس نے ہسپتال کا کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اسٹیشن پر آ گیا۔ گاڑی آئی اور وہ ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ایس ٹی نے اُسے کوئی فقیر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اُس سے ٹکٹ نہ مانگا۔

لوگ اُس سے نفرت کر رہے تھے۔ وہ کھانس رہا تھا۔ لوگوں نے رومال ناک پر رکھ لیے تھے کچھ اُٹھ کر دوسری طرف چلے گئے تھے۔ وہ بھلا ٹی بی کے مریض کے پاس کیسے بیٹھ سکتے تھے۔ ایک صاحب بولے۔

"بابا! تمہیں یہاں کس نے گھسنے دیا ۔۔۔"

نواب نے اُسے گھورا۔

"شٹ اپ ۔۔۔"

وہ گھبرا کر دوسری طرف چلا گیا۔

جب گاڑی ملتان کے اسٹیشن پر رکی تو رات کے دو بج رہے تھے۔ بخار سے اُس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ بہت ہی بری حالت تھی اُس کی وہ گاڑی سے اُترا، جیسے کیسے پلیٹ فارم پر گھسٹتا ہوا باہر آ گیا۔

سب ٹیکسی ڈرائیور کاروں کے شیشے چڑھائے سو رہے تھے۔ اس نے ایک



ٹیکسی کے شیشے پر زور سے دستک دی۔ ڈرائیور کی آنکھ کھلی مسافر کی اُمید لیے اُس نے بیٹھتے ہوئے دروازے کا شیشہ کچھ نیچے کیا۔

"کریم نگر لے چلو بھیا ۔۔۔"

اس نے منت کی۔

"ابھی ۔۔۔"

اُس نے اس کی حالت پر غور کیا۔

"ہاں ۔۔۔"

کھانسی پر قابو پاتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔

"لیکن اس وقت تو بارش کے سبب وہاں کا راستہ بہت خراب ہو گیا ہو گا۔ اس طرف رات میں جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔"

"تمہیں جتنے روپے چاہئیں میں وہاں پہنچتے ہی دے دوں گا ۔۔۔"

اُس نے پھر منت آمیز لہجے میں کہا۔

"بس مجھے وہاں کی حویلی تک پہنچا دو ۔۔۔"

"حویلی؟ ۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ میں نواب ارجمند ہوں ۔۔۔"

"نواب ارجمند خاں ۔۔۔"

ڈرائیور نے اُسے اور بھی غور سے دیکھا۔ جھانکنے کی کوشش کرتے

ہوئے اوپر سے نیچے تک پھر ایک بہت زوردار قہقہہ لگایا۔ ہاہاہاہا ——
" ہاہاہاہا —— " ہاہاہاہا —— " نواب ارجمند! ہاہاہاہا، ہاہاہاہا۔"
پھر سنجیدہ
ہو کر اُس پر برس پڑا۔
"چل بھاگ یہاں سے کمبخت نے نیند حرام کر دی —— پاگل ——"
"نواب ارجمند کو اُس پر سخت غصہ آیا۔ لیکن اپنی ظاہرہ حالت کا اندازہ کر کے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس وقت وہ کیا ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

وہ وہاں سے ہٹ کر ایک طرف چلے گئے۔ ایک تانگے والا سو رہا تھا۔ انہوں نے چپکے سے آگے بڑھ کر تانگہ سنبھال لیا۔ اور گرتے پڑتے اُسے ہانکنے لگے۔

وہ بہت دور نکل آئے۔ بارش ہو چکی تھی۔ اچانک گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا۔ گھوڑا پھر نہ اٹھ سکا —— وہ بھی اُٹھنے کے قابل نہ رہ سکے اُنہیں سخت پیاس لگی تھی۔ بارش کا پانی ارد گرد گڑھوں میں جمع تھا۔ مگر وہ پانی کی ایک بوند کو ترس رہے تھے۔ پانی کا ایک گھونٹ پلانے والا کوئی نہ تھا کس موڑ پر لے آئی تھی زندگی! —— اور وہ پانی کو ترستے ہی رہ گئے۔

افق پر
جھلملاتی روشنی میں اُنہوں نے دیکھا کہ ان کی زندگی کی حقیقت ان کے



سامنے مجسم کھڑی ہے۔ شاندار حویلی۔ رنگ محل۔ آگے پیچھے تعینات سپاہی پہرے دار —— ہرے بھرے لہلہاتے کھیت۔ کھلیان اور ان ہی کے بیچ مزلہ سے ان کی پہلی ملاقات —— پھر دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اُسے اغوا کرا کے اپنے محل میں لے آئے تھے۔

انہوں نے اُسے محل کی سب سے بلند منزل پر لے جا کر دور دور تک اس علاقے کو دکھلایا تھا۔ اپنے پیار کی خاطر سب کچھ اس کے قدموں میں رکھ دینا چاہا تھا۔ لیکن اپنی خودی کو ٹھیس لگا کر اُس نے ان تمام چیزوں کو قبول کرنے کی ایک بار بھی تمنا ظاہر نہیں کی تھی۔

ان کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر بھی گھوم گیا۔ جب اپنی منگنی کے دن اُسے تلاش کرتے کرتے وہ بھٹک کر مزلہ کے سامنے پہنچ گئے تھے اور گھٹنوں کے بل جھک کر اُنہوں نے اس کے روبرو اپنی پلکوں کی جھولی پھیلا کر اُس سے معافی کی درخواست کی تھی۔

شاید اس لمحے مزلہ کا دل ان کے لیے ہمدردی سے بھر گیا تھا۔ شاید وہ انہیں معاف کر دیتی۔ شاید اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینے کو وہ تڑپ بھی اٹھی تھی۔ لیکن ....... لیکن جانے کیوں بھٹک گئی تھی۔ بھٹک کر راتوں رات گاؤں چھوڑ دیا تھا۔

ان کی پھولتی ہوئی سانسیں مدھم پڑ گئیں۔ جسم بے حرکت ہو چکا تھا آنکھ

کی کوئی رگ دماغ کی مدد سے اب بھی کام کر رہی تھی۔ اس لیے اس حقیقت کے بعد انہوں نے ایک خواب بھی دیکھا انہوں نے دیکھا کہ مزلہ ان کے قریب بیٹھی ہے۔ بالکل قریب۔ وہ نواب ارجمند ہیں اور وہ ان کی بیوی۔ اس کے حسین چہرے اور سڈول جسم پر قیمتی پوشاک کس قدر زیب دے رہی ہے۔ مزلہ کتنی خوبصورت ہے۔ کس قدر حسین کہ اسے مسلسل دیکھتے رہنے کے بعد بھی ان کا دل دیکھتے ہی رہنے کو کر رہا تھا۔

انہیں دیکھ کر جب وہ مسکراتی تو کریم نگر کی روش روش پہ بہار آجاتی۔ یہاں کے لوگ اس کی تعظیم میں جھک جاتے۔ مزلہ کے حسن و جمال کو دیکھ کر دور دور کے نوابوں کو ان سے رشک پیدا ہو گیا۔

اس تصور، اس خواب نے ان کے ہونٹوں کو ایک مسکراہٹ سے ہم آغوش کرنا چاہا۔ لیکن جیسے ان ہونٹوں میں جان ہی نہیں تھی۔ ہونٹ کھلے تو کھلے ہی رہ گئے۔ پلکوں کے اشکوں نے گالوں سے بہہ کر ہونٹوں کی پیاس بجھانا چاہی۔ لیکن ہوا کے دباؤ نے ان کا رخ بدل کر الجھی ہوئی ڈاڑھی میں دھکیل دیا۔ انہیں ایک ہچکی آئی بہت ہی ہلکی سی۔ ان کے کان بھی اس کی آواز نہ سن سکے شاید کان کے پردے بھی بے حس ہو چکے تھے۔ پھر سینے کے جانے کسی گوشے میں چھپا ہوا لہو کا ایک آخری قطرہ ان کے ہونٹوں پہ آ کر پھیل گیا۔



ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ پلکوں کی نوک پر آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں صبح کی شبنم کی طرح اٹکی چمک رہی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ پتلیوں کے آئینے پر منعکس ہوتے ہوئے انہوں نے آخری بار محسوس کیا۔ آسمان پر بڑے بڑے پرندے اڑ رہے ہیں۔ گدھ، کوّے ان کے قریب آتے جا رہے ہیں اور بس، کچھ بھی اس کے آگے وہ محسوس نہیں کر سکے۔

دفعتاً

حویلی کے عقبی حصے، مزدوروں کے کیمپ کے اس پار جہاں تاڑ کے لانبے لانبے درخت کھڑے تھے۔ چند بڑے بڑے گدھ ہوائی جہاز کی طرح پنکھ پھیلائے اڑتے ہوئے حویلی کے اوپر سے گذرے تو ان کی سنسناہٹ کی آواز نے مزلہ کا ذہن ان کی طرف مائل کر دیا۔ اس نے دیکھا ایک ہی نہیں کئی گدھ ایک کے بعد ایک پنکھ پھیلائے بہت تیزی کے ساتھ کچھ دور جا کر نیچے آ رہے ہیں۔ وہ کوٹھے پر اور کنارے آئی۔ بہت غور سے اس نے دیکھا — دور بہت دور — ایک مقام پر گدھوں کا غول بڑھتا جا رہا ہے۔ جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔

ابھی ناشتے کے لیے زاہد ماں کو لینے اوپر پہنچا۔ زاہد کے مکمل صحتیاب ہونے کے بعد شاہدہ سے اس کی شادی ہو گئی تھی چونکہ کریم نگر میں تعمیر کا کام جاری تھا

اس لیے زاہد اپنی ماں اور بیگم شاہدہ کے ساتھ کریم نگر کی حویلی میں ہی آکر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔

"ماں! چلو نا! ناشتہ تیار ہو چکا ہے۔ اور تم نے ابھی تک غسل بھی نہیں کیا۔"

زاہد نے اسے کمر سے تھام لیا۔

لیکن مزلہ کی توجہ اسی طرف رہی۔ اس نے پوچھا۔

"بیٹا وہاں اتنے سارے گدھ کیوں جمع ہیں۔"

"کوئی جانور مر گیا ہوگا ماں!۔۔۔"

اس نے بھی اسی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانور!۔۔۔"

"ہاں ماں!۔۔۔"

وہ بولا۔

"شاید پچھلی شب کی طوفانی بارش سے بچنے کے لیے اسے کہیں پناہ نہ مل سکی ہو گی۔"

مزلہ

کچھ

نہیں بولی۔ دھڑکنوں پر قابو پانے کی سعی کرنے لگی۔ تو جانے کیوں بے اختیار



کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ "جانور!" اس بنجر علاقے میں بارش نہ ہونے پر
ی جانوروں کا پھنس جانا بہت معمولی بات ہے۔

"آؤ چلو ماں!۔۔۔ اتنا زیادہ نہیں سوچا کرتے!۔۔۔"

زاہد نے اس کی پلکوں کے آنسو اپنی انگلیوں میں جذب کر لیے۔

"تمہیں میری قسم جواب ذرا بھی کھوئی کھوئی سی رہیں۔۔۔ کیا تمہیں اپنے ٹے کی خاطر بہو کی صحت اور اس کی زندگی کا ذرا بھی خیال نہیں۔"

مزلہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ مسکراتے وقت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہونٹوں پر سوئیاں چبھو دی ہوں۔ زاہد کے ساتھ ہو کر وہ سیڑھیاں اتر گئی۔ آج تمام دن وہ کوٹھے پر نہیں گئی۔

زاہد اور شاہدہ سے باتیں کرتی رہی۔ یوم آزادی تھا۔ اس لیے اس کی بھی چھٹی تھی۔ اس تمام دن مزلہ نے اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ بہو کی صحت پہلے ہی زرد آمیز تھی۔ اس لیے اس نے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔

نہ جانے کیوں اسے زاہد کی باتوں پر اعتبار ہو چلا تھا کہ اب زاہد کے والد اس دنیا میں نہیں رہے دنیا میں ہوتے تو یہ جانتے ہی پنکھ پھیلا کر اڑتے چلے آتے کہ مزلہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ وہ ان کا انتظار کر رہی ہے۔

شام تنہا

تنہا تھی۔ خاموش مزدور اور دیگر افسران ابھی تک کیمپ پر واپس

نہیں آئے تھے۔ شاید کل صبح تک آجائیں رات میں آنے کی کم ہی اُمید تھی۔ زاہد۔ شاہدہ اور ماں کو لے کر ٹہلنے کے لیے نکل پڑا۔ آج دن بھر بارش نہیں ہوئی تھی۔

دھوپ اتنی سخت تھی کہ جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں۔ شام ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ دور دور تک نیلگوں آسمان چپکے چپکے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سرخی کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے آگے بڑھتے بڑھتے افق شفق کی تجلیوں سے لالہ زار ہو گیا۔ تو پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ پڑے گدھ حویلی کے پیچھے لگے تاڑ کے درختوں کی طرف اڑ چلے۔

اچانک مزلہ کی نظریں گھومتی ہوئی ایک مقام پر جا کر منجمد ہو گئیں دل بہت زور سے دھڑکا۔ سڑک کے کچھ دور ہی ناگ لینی کے پودے کی آڑ میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔ کسی جانور کا شاید کسی انسان ہی کا ڈھانچہ ہو۔

نظر پھیر کر اُس نے زاہد اور شاہدہ کی جانب دیکھا۔ جو بہت خوش تھے۔ اور ہنسی مذاق کرتے آتے تھے۔ وہ ٹہلتے ہوئے اس سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ مزلہ کے قدم اپنے آپ ہی اس ڈھانچے کی سمت بڑھ گئے۔

ایک انجانی طاقت تھی۔ ایک انجانی کشش تھی۔ جس نے اُس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اُس کے سارے جسم، اُس کے قدموں کو بھی اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ کچھ کوّے ابھی تک اس ڈھانچے پر رہا سہا



گوشت نوچ کر کھا رہے تھے۔

اس کے

وہاں پہنچتے ہی وہ پھدک کر ایک طرف جا کھڑے ہوئے۔ مزلہ کے نتھنوں میں کثیف بدبو کا ایک جھونکا سرایت کر گیا۔ لیکن اُس نے اپنی ناک پہ رومال یا آنچل نہیں رکھا۔ کچھ دور ہی سے اُس کی نظر ناگ لینی کے پودے پر پڑی۔ اُس نے دیکھا۔ کے کانٹوں کے درمیان کہیں کہیں لانبے لانبے نیم سفید بال اُلجھے ہوئے ہیں۔

اُس کے قدم لڑکھڑا گئے وہ اور قریب پہنچی اور قریب اُس نے دیکھا یہ کسی انسان کا ڈھانچہ ہے۔ شاید کوئی فقیر تھا۔ شاید کوئی پاگل تھا۔ جو گذشتہ رات طوفان کا شکار ہو کر یہاں پھنس گیا تھا۔ شاید کوئی اجنبی مسافر تھا جسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رات کے وقت کریم نگر کا راستہ اپنا خطرے سے خالی نہیں۔

جھک کر اُس نے دیکھا۔ ہڈیوں کے جوڑوں پر جہاں جہاں تھوڑا بہت گوشت چپکا رہ گیا تھا۔ وہاں سرخ چیونٹیاں اور چیونٹے چمٹے ہوئے اُس کے جسم کے کپڑے بھی نگل لیے تھے۔ صرف کہیں کہیں ہی کپڑوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے کیچڑ میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

دفعتاً مزلہ کا دل بہت زور سے دھڑکا اتنی زور سے جیسے اس بار

دھڑک کر اس کی دھڑکن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ ہونٹ ہی نہیں سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کی آنکھیں جیسے پتھرا گئیں۔ نگاہیں ایک ہی مرکز پر منجمد ہو کر رہ گئیں۔ ایک ہی مقام پر۔ جہاں ڈھلتے آفتاب کی روشنی میں ایک سپید شے چمک رہی تھی۔

ڈھانچے کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے۔ یہ بایاں بازو تھا جس کے قریب ہی ایک انگوٹھی پڑی تھی۔ چاندی کی انگوٹھی —— مزلہ کو چکر آ گیا۔ یہ زمین —— یہ آسمان —— ساری کائنات ڈگمگا گئی۔ وہ انگوٹھی کے اور قریب آئی —— بالکل قریب —— گھٹنوں کے بل جھک کر اُس نے کانپتے ہاتھوں سے انگوٹھی اٹھالی —— غور سے دیکھا —— مزلہ —— جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ پکار اُٹھا —— مزلہ —— جیسے ڈھانچے کی ہڈی ہڈی عضو عضو، کے ہونٹوں سے یہ آواز ابل پڑی —— مزلہ —— یہی ایک نام انگوٹھی پر نقش تھا۔

اس کا دل تڑپ اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ آنسوؤں کی ایک بوند جب اس انگوٹھی پر گری تو لفظ مزلہ اس کے طوفان میں ڈوب گیا۔ اور اُس نے دیکھا۔ اس کی جگہ ایک شکل اُبھر آئی ہے۔ ایک منظر اجاگر ہوا اٹھا تھا۔ جب پہلی بار وہ نواب ارجمند سے کھلیان پر ملی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر بھی تصویر بن کر آیا۔ جب نواب ارجمند نے اُسے حویلی کی



سب سے بالائی منزل پر لے جا کر اپنے پیار کی خاطر کریم نگر کا سارا علاقہ اُس کے قدموں میں رکھ دینا چاہا تھا۔ اور وہ آخری ملاقات جب نواب ارجمند کی حیثیت میں ہو کر بھی اُنھوں نے اُس کی زبان سے پیار کے دو الفاظ حاصل کرنے کے لیے اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ کس قدر منت سماجت کے ساتھ وہ معافی مانگ رہے تھے۔ مزلہ کا دل پھٹ گیا۔ اُس نے دل کی گہرائی سے آرزو کی کہ یہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

یہ

آسمان

اُس کے سر پر گر پڑے درد اُس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کتنی سنگدل ہے۔ کتنی بے رحم ہے۔ پاپن ہے گنہگار ہے۔ جو ایک عورت ہو کر بھی اپنی خودی اور غرور سے مغلوب ہو کر ایک ایسے فرشتے کو معاف نہیں کر سکی جو اس کے بیٹے کا باپ تھا۔ وہ تڑپ کر رو پڑی دل نے کہا کہ بڑھ کر ہڈیوں کے ڈھانچے سے لپٹ جائے۔ اپنی جان دے دے۔ گدھ اور کوّے اس کا گوشت بھی نوچ نوچ کر کھا جائیں۔ چیونٹے اور چیونٹیاں اس کے ڈھانچے میں بھی اسی طرح چمٹی رہیں۔ وہ پیار کے جذبے میں اور جذبے کے پاگل پن میں ہڈیوں کے ڈھانچے پر گر بھی پڑتی لیکن جونہی ایسا کرنے کے خیال سے کھڑے ہو کر اس نے آگے بڑھنا چاہا۔ کہ تب ہی ایک آواز —— ایک آواز اُس

مزلہ نے شام کی تیز ہوتی ہوئی ہواؤں کا لمس محسوس کرتے ہوئے سنا نواب ارجمند کہہ رہے تھے۔ "یہ انگوٹھی میری انگلی سے اسی وقت اترے گی جب تم مجھے معاف کر دو گی۔ اور اسے واپس لے کر تم اپنی انگلی میں پہن لو گی تو میں سمجھ لوں گا کہ تمہارے دل میں میرے پیار کا ایک مقام بن چکا ہے۔"

مزلہ نے بہت آہستہ سے چھپا کر انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔

"کیا بات ہے ماں ا——"

اُس کے چہرے کی تلخ مسکراہٹ کا اندازہ لگاتے ہوئے زاہد نے پوچھا۔

"تم پھر اُداس ہو گئیں۔ آج دن بھر تو تم بہت خوش تھیں——" ضبط کرنے کے باوجود مزلہ کی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ گلوگیر آواز میں اُس نے کہا۔

"بیٹے آخر دھیرے دھیرے ہی تو زخم بھرے گا ا——"

اور پھر اُس نے بہو کا ہاتھ تھام لیا۔ بولی۔

"چلو ا——" اُس شام دھند لکا گہرا ہونے کے بعد ہی وہ ٹہل کر واپس آئے۔ اُس رات جب زاہد اور شاہدہ اپنے کمرے میں محوِ خواب تھے تو وہ پریشانیوں کے سمندر میں کھوئی ہوئی تھی۔ آخر کار اُس سے نہ رہا گیا۔ اُسے اب کسی نتیجے کی پرواہ نہ رہی تھی۔

اُس نے اُن کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ دونوں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ زاہد اور شاہدہ نے اُسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ مزلہ رو رہی



کی سماعت سے یوں ٹکرائی کہ اُس کے پیروں میں بیڑیاں پڑ گئیں۔

وہ ٹھٹھک گئی۔

"ماں ا——"

زاہد بہت دور کھڑا اُسے اچانک ہی ایک جگہ رکا دیکھ کر آواز دے رہا تھا۔

"آؤ نا ماں! ساتھ ساتھ چلو ا——"

مزلہ نے آنسو پی جانے کی سعی کی تو اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کی تو لب کانپنے لگے۔ دل چاہتا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر اپنا سینہ پیٹ لے۔ اپنے بال نوچ ڈالے لیکن پھر دل پہ جبر کا پتھر رکھ لیا۔

اگر زاہد کو اپنے باپ کے متعلق علم ہونے کے بعد صدمہ پہنچا تو شاہدہ بھی اُسے برداشت نہیں کر سکے گی۔ یہ صدمہ زاہد کے لیے خطرناک ہو گا۔ اور شاہدہ کے لیے نہایت نقصان دہ۔ شاہدہ کی صحت پہلے ہی اچھی نہیں ہے۔ پھر جانے کیا نتیجہ نکلے۔

اُس نے دیکھا شاہدہ اور زاہد اُس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ تو وہ ضبطِ غم سے ہونٹوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتی ہوئی سڑک پہ ہو لی۔ جبراً مسکرانے کی سعی کرتے ہوئے آگے بڑھی تو زاہد اور شاہدہ رک کر اُس کا انتظار کرنے لگے۔

تھی۔ اُس نے روتے روتے انہیں اس ڈھانچے کے متعلق بتایا۔ جب زاہد اور شاہدہ کو نواب ارجمند کے متعلق پتہ چلا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور منزلہ محسوس کرنے لگی کہ جب تک وہ زندہ ہے تو اس کے دل میں نواب کے پیار کی "شمع جلتی رہے گی ——"

جب وہ ذرا سنبھلے تو انہیں ڈھانچے کے تجہیز و تکفین کا خیال آیا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے جنازہ تیار کیا۔ اور محلے کے لوگوں کے ساتھ مل کر اُسے پورے ادب و احترام سے دفن کر دیا۔

جب وہ قبر پر کھڑے فاتحہ خوانی کر رہے تھے تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا —— اور ہوائیں ماتمی راگ الاپ رہی تھیں —— ایک غم آلود چادر سی جیسے کائنات پر تن گئی تھی۔

اور جیسے
سب کچھ اُس کی لپیٹ میں آگیا تھا —— "—— "

ختم شد